ISSN - 2582-4619 - VOL 63 - ISSUE 02 - 25 NOVEMBER 2025

TAMEER-E-HAYAT

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

گناہ کے اثرات ونتائج

”گناہ سے انسانی شرافت مسخ اور اس کی روح مردہ ہو جاتی ہے، اور اس کے اخلاقی فضائل کا خاتمہ ہو جاتا ہے، گناہوں کا عمداً اور علانیہ ارتکاب اور اس پر اصرار اللہ اور رسول کیا، دنیاوی مصلح اور دنیاوی حکومتیں بھی گوارا نہیں کر سکتیں، اگر جرم اور گناہ کی آزادی دے دی جائے تو دنیا میں بداخلاقی اور ظلم وزیادتی کا دور دورہ ہو جائے، حقوق العباد میں ایک حق بھی محفوظ نہ رہے اور دنیا کا سارا نظم درہم برہم ہو جائے، اسی کے انسداد کے لیے دنیاوی حکومتیں بھی قانون بناتی ہیں، اگر قانون کے مؤاخذہ کا خوف نہ ہو تو بدی اور شر کی حکومت قائم ہو جائے، اس لیے انسانی معاشرہ کے قیام اور انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے عفو ودرگذر سے زیادہ مؤاخذہ ضروری ہے جس کے بغیر عدل قائم نہیں ہو سکتا، اس لیے گناہوں پر عفو ودرگذر کی آیات واحادیث سے زیادہ مؤاخذہ اور وعید کی آیات واحادیث آئی ہیں۔“

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

(دین رحمت)

۲۵؍نومبر ۲۰۲۵ء

فی شمارہ -/25₹

سالانہ زرتعاون 500₹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ — ۲۵؍نومبر ۲۰۲۵ء مطابق ۳؍جمادی الثانی ۱۴۴۷ھ — شمارہ نمبر ۲

اس شمارے میں

مناجات	محترمہ امۃ اللہ تسنیمؒ	۴
سلیمان ذی شانِ ندوہ	محمد عمیر الصدیق ندوی	۵
اسلام کا تصورِ علم	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
غیر اللہ کی قسم-کبیرہ گناہ اور شرکیہ عمل	عبدالرشید راجستھانی ندوی	۱۰
مولانا محب اللہ لاری ندویؒ	مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی	۱۱
لباس-قرآن وسنت کی روشنی میں	مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی	۱۵
اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق	ڈاکٹر سراج الدین ندوی	۱۷
تحریف قرآن اور مصنوعی ذہانت	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۱۹
عہدِ حاضر میں تصوف کی معنویت	شاہ اجمل فاروق ندوی	۲۲
درود-رحمتوں کا خزینہ	محمد سمعان خلیفہ ندوی	۲۴
دلوں کا سکون وقرار ذکرِ الٰہی میں	محمد جاوید اختر ندوی	۲۶
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۲۷
قوتِ فکر وعمل پہلے فنا ہوتی ہے	محمد انصار ندوی	۲۹
بین المذاہب آفاقیت ومقامیت کی کشمکش	محمد نفیس خان ندوی	۳۱
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 – Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER–E–HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعروادب

مناجات

محترمہ امۃ اللہ تسنیمؔ (ہمشیرہ مفکر اسلامؒ)

بنا کر اپنا مرکز دل کو تو ایسا سما جائے
کہ تجھ کو پاکر یہ بے چین دل تسکین پاجائے

یہ روح، کنج قفس میں پھڑپھڑائے اور مچل جائے
تجھی کو یاد کرتے کرتے میرا دم نکل جائے

بسا ہو تُو نہ جس کے دل میں دل بیکار ہے بالکل
نہ ہوگر باغ گل تو وہ گلشن خار ہے

میرے رب مہرباں ہو جا، تجھے صدقہ کریمی کا
یہ کلفت پیش خیمہ ہو تیری ذرہ نوازی کا

بہت بے لطف اور بے کیف گذری زندگی اتنی
کٹے اب تیری طاعت میں ہے باقی زندگی جتنی

ہوئے ہوں عمر میں جتنے گنہ سب معاف کردے تو
الٰہی ہر برائی سے مرا دل صاف کردے تو

اطاعت ہو شعار اپنا عباد ت ذوق بن جائے
مرا ہر ہر قدم یا رب سراپا شوق بن جائے

گناہ آلود دل کو پاک کر دے آبِ رحمت سے
مجھے خلعت ملے بخشش کی تری باب رحمت سے

جیوں تیری طلب میں اور مروں تیری محبت میں
یہ پوری زندگی گذرے الٰہی تیری مدحت میں

تیری شفقت تو مادر اور پدر سے ہے کہیں زائد
نہ ہو میری پکڑ بالکل نہ ہو کوئی سزا عائد

مجھے اتنی محبت دے بنوں تصویر الفت کی
سراپا شوق بن کر توڑ دوں زنجیر فرقت کی

بچا کر نفس و شیطاں سے مجھے اپنا ہی راغب کر
ہٹا کر دارِ فانی سے میرا دل اپنی جانب کر

رہے تسنیمؔ ہر لحظہ تیرے ہی ذکر میں شاغل
تیری بندہ نوازی سے یہ درجہ اس کو ہو حاصل

اداریہ

سلیمان ذی شانِ ندوہ

محمد عمیر الصدیق ندوی

نومبر کا مہینہ ہے۔ تین دن بعد یعنی ۲۳/نومبر کا دن اس لیے یاد کرنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسی روز ندویوں کی سب سے بڑی دینی وعلمی علامت حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ عمر ساری ندوہ اور ندوہ کی علمی تعبیر وتفسیر دارالمصنفین میں کٹی؛ لیکن نیکیوں کے اعمال نامہ میں عملِ ہجرت کی شاید کوئی ایک تمنا رہ گئی تھی جو کراچی جا کر پوری ہوئی۔ سید صاحبؒ اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گئے؛ لیکن بقائے دوام کی دنیا میں وہ اپنے عقیدت مندوں کی فکر ونظر سے کبھی دور نہیں رہے۔ ان کو جب جب یاد کیا گیا...... اور یہ یاد کرنے والے بھی وہ تھے جو علم وتحقیق اور ادب وتاریخ کی مملکتوں کے سربراہ تھے، جیسے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ...... ان کی زبان پر سید صاحبؒ کے لیے 'عہد کے سب سے بڑے سیرت نگار نبوی'، 'متکلم اسلام' اور 'محقق مصنف' جیسے الفاظ جاری رہتے۔ مولانا فرماتے کہ وہ عہد ہی نہیں' تاریخ اسلام کے ممتاز ترین سیرت نگار اس لیے تھے، اور منفرد تھے، کہ انھوں نے سیرت کا دائرہ صاحبِ سیرت صلعم کی حیاتِ طیبہ، حالات وواقعات اور شمائل وعادات سے بڑھا کر پیغامِ محمدیؐ، تعلیماتِ نبویؐ اور شریعتِ اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا۔ سید صاحبؒ نے اس سرمایۂ سیرت کو ایسے علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے پیشوایانِ مذہب اور ان کی تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا ایسا اہتمام کیا کہ ان کی لکھی سیرت ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لیے رشد وہدایت کا صحیفہ بن گئی۔ اور اب تو وہ سیرت کی ایسی انسائیکلوپیڈیا ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں نہیں۔

سید صاحبؒ کو یاد کرتے وقت ندوہ کے بانیوں کی نیت، اور مقاصد، اور توقعات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت اساتذہ کی بھی ہے، طلبہ کی بھی ہے؛ بلکہ پوری امت کی ہے۔ سید صاحبؒ نے اگر یہ کارنامہ انجام دیا کہ سیرت سے علمِ کلام کا کام لیا، اور ایسے علمِ کلام کی بنیاد ڈالی جو تاریخ، عملی زندگی، فطرتِ انسانی اور عقل وقلب' سب کے لیے قابلِ قبول ہو تو گویا پہلی بار علمِ کلام کو زیادہ مؤثر، عام فہم، اور مفید بنانے کا یہ عمل سید صاحبؒ کے ذریعہ ندوہ کی تعلیم و تربیت نے بحسن وخوبی انجام دیا۔

سیرت کے ذکر سے عموماً ذہن اس سیرۃ النبی ﷺ کی جانب منتقل ہوتا ہے جو علامہ شبلی ومولانا سلیمان ندوی کی حیاتِ جاوید کا استعارہ ہے؛ لیکن سیرت کے تعلق سے خطباتِ مدراس کی کیا بات ہے!!!۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے زیادہ بلیغ تعارف کسی نے نہ کرایا ہوگا، جب انھوں نے لکھا کہ: میرے محدود علم میں (اس علم کی محدودیت کو دیکھیے اور حضرت مولانا علی میاںؒ کی شخصیت کو دیکھیے) کسی اسلامی زبان میں سیرت پر اتنی طاقتور، دل آویز، دل پذیر اور ایمان آفریں کتاب دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس میں سیرت کے کتب خانہ کا عطر آ گیا ہے۔

سید صاحبؒ دراصل تحریکِ ندوہ کا اصل اور حقیقی آئینہ تھے۔ ندوہ کے نصاب کا بنیادی مقصد' قرآنیات کے جہانِ بیکراں کی سیر ہے۔ سید صاحب' متکلم ومؤرخ، سب تھے؛ لیکن ان الفاظ کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن اور علومِ قرآنیہ کا اتنا وسیع اور گہرا علم کہیں اور نہیں ملا۔

قرآنیات اور سیرت نگاری، یہ دونوں وہ بنیادی محرکات ہیں جو علماء کو جامعیت اور تنوع کی نعمت عطا کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ سید صاحبؒ اس زمانہ کے طالب علم تھے جب قدیم وجدید کی رقابتوں کے قصے عام تھے۔ صلاحیتوں کی ایک بڑی مقدار یا تعداد صرف اس نزاع کے نتیجے نکالنے میں صرف ہو رہی تھی کہ فرسودہ کون ہے، فائدہ کس میں ہے؟۔ ندوہ نے یہ پہلی بار کیا کہ اس بڑھتی ہوئی رقابت کو رفاقت میں بدلنے کا نعرہ بلند کر دیا۔ قدیم وجدید دونوں قلمرؤوں کی ثنوی شہریتوں کو ندوہ نے پہلی بار ایک ہی شہریت میں بدلنے کا عزم کیا۔ جہاں دو سرحدیں تھیں، ندوہ نے ان کو ایک وسیع ترین دائرہ میں دنیا کے کرہ کی بلکہ کائنات کی بے سرحدی میں بدل دینے کی ہمت کی۔ اور اس ہمت کا سب سے خوبصورت اور پائیدار منظر پیش کرنے کے لیے اس نے

حضرت سید صاحبؒ کے قالب میں اپنی تلاش و جستجو کو پالیا اور پیش کردیا۔ یہ منظر' جدید ہوتے ہوئے بھی اصلاً قدیم ہی کی روایت کی تجدید تھا۔ اسی لیے مولانا علی میاں ندویؒ نے اس کو' قدیم جامعیت' کے احیاء سے تعبیر کیا۔ سید صاحبؒ کی شکل میں اصلاً ندوہ تھا جو علمی و دینی حلقوں میں بیک وقت صرف باریاب ہی نہیں' صدر نشیں ہوگیا۔ ندوہ کا مقصد صرف یہی نہیں رہا۔ اس کے خمیر وضمیر میں وہ معرکۂ کہن ہمیشہ برپا رہا جہاں 'عشق تمام مصطفی' اور 'عقل تمام بولہب' کا فیصلہ ہوتا ہے، اور جب قلب ونظر کو یہ خبر ہوتی ہے کہ محض علم، نخیلِ بے رطب ہی ہوتا ہے۔

سید صاحبؒ نے عقل و عشق، قدیم و جدید، مشرق ومغرب، دین وادب اور مذہب وفلسفہ کی معرکہ آرائی میں جس طرح اپنے وجود سے مقاصدِ ندوہ کو سرخ رو کیا' اس کی مثال خود سید صاحبؒ کے تربیت یافتہ اور وقت کے ایک سب سے بڑے ندوی کو کہیں اور نظر نہ آئی۔

سید صاحبؒ کی ایک علمی وصیت کا ذکر مولانا ابوالعرفان خاں ندویؒ نے کیا۔ اس نصیحت کا وقت، درسِ قرآن کے لمحات میں سامنے آیا۔ فرمایا کہ:

"تم لوگوں کو میری ایک وصیت ونصیحت ہے کہ اہلِ سنت والجماعت کے آراء ومعتقدات سے انحراف نہ ہو۔ علمی وتحقیقی طور پر بھی ان کی رائیں صحیح ہیں"۔

یہ نصیحت دیکھیے، اور اپنے ماحول کو دیکھیے!۔ ندوہ، قرآن کی زبان میں کہتا نظر آئے گا کہ:

"فهل من مدّکر؟؟!!"۔

علم نافع پر خصوصی توجہ اور زور

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اسلام کی علمی تحریک کی ایک اہم خصوصیت اس کا علم نافع پر زور دینا ہے، جو ہدایت کا حامل، نجات کا ضامن، آخرت میں مفید ہو، اور وہ ایسا علم ہے، جس پر انسان کی سعادت ونجات موقوف ہے، اس کے ذریعہ سے وہ اپنے اور اس کائنات کے خالق ومالک اور اس دنیا کے چلانے والے کی ذات وصفات عالیہ کی معرفت صحیح حاصل کرتا ہے، اور اپنے اور اس کے درمیان ربط وتعلق کو سمجھتا ہے، اور اس کی رضامندی وناراضگی، اور آخرت میں اپنی سعادت وشقاوت کے اسباب کو جانتا ہے، اللہ تعالیٰ ان لوگوں اور گروہوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے، جو نجات وسعادت کے ضامن اور معرفت صحیحہ کے حامل علم سے محروم ہیں، اور ان کا سرمایۂ حیات وہ علم ہے، جو اس راہ میں قطعاً مفید نہیں، بلکہ اکثر اوقات رہزن ثابت ہوتا ہے:

"يَعْلَمُونَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُون" [سورۃ الروم: ۷] (یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہیں)۔

اور فرماتے ہیں: "بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُم مِّنْهَا عَمُون" [سورۃ النمل: ٦٦] (بلکہ آخرت (کے بارے) میں ان کا علم منتہی ہو چکا ہے بلکہ وہ اس کی طرف سے شک میں ہیں، بلکہ اس سے اندھے ہو رہے ہیں)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: "قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالاً الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْناً" [سورۃ الکہف: ۱۰۳-۱۰۵] (کہہ دو کہ ہم تمہیں بتائیں جو عملوں کے لحاظ سے بڑے نقصان میں ہیں، وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہو گئی اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں، وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کے سامنے جانے سے انکار کر دیا، تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے، اور ہم قیامت کے دن ان کے لئے کچھ بھی وزن قائم نہیں کریں گے)۔

حدیث شریف میں دعا مانگی گئی ہے:

اللّٰهم إني أعوذ بك من علم لا ينفع ومن قلب لا يخشع ومن نفس لا تشبع ومن دعوة لا يستجاب لها (اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے، ایسے دل سے جس میں تیرا ڈر نہ ہو اور ایسے نفس سے جو آسودہ ہونا جانتا نہ ہو، اور ایسی دعوت سے جو قبولیت سے سرفراز نہ ہو)۔

بصیرت افروز

اسلام کا تصورِ علم

(دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے ۱۵۷ رسالہ جشن تعلیمی مؤرخہ یکم نومبر ۲۰۲۵ء کے موقع پر اجلاس عام میں کیا گیا ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کا صدارتی خطاب)

ضبط وپیشکش: محمد ارمغان بدایونی ندوی

الحمد لله رب العالمين والصلاة و السلام علىٰ سيد المرسلين وخاتم النبيين سيدنا ونبينا ومولانا محمد وعلىٰ آله و صحبه أجمعين وعلىٰ من تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلىٰ يوم الدين أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمٰن الرحيم: {اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ٭ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ٭ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ٭ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ٭ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ} صدق الله العظيم۔

حضرات علماء کرام، دانشوران ملت اور میرے دینی وایمانی بھائیو!

اس وقت تعلیم کی بڑی نزاکتیں ہیں، چاہے وہ کسی بھی حیثیت سے ہوں، ہمارے مدارس میں ہوں، یا اسکولز وکالجز اور یونیورسٹیوں میں ہوں، تعلیم کا مسئلہ اس وقت ہم سب کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ سماج تعلیم سے ہی بنتا ہے، اگر تعلیم کا رخ صحیح ہے تو سماج صحیح رخ پر چلتا ہے اور اگر تعلیم کا رخ صحیح نہیں ہے تو پھر سماج بجائے انسانوں کے جانور پیدا کرتا ہے۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ یہ بات فرماتے تھے کہ آج کی تعلیم کے نتیجہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں سے انسانوں کے بجائے جانوروں کے ریوڑ تیار ہو رہے ہیں۔ موجودہ صورت حال میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آج جہالت پڑھ لکھ گئی ہے، ایک زمانہ جاہلیت کا تھا جس میں انسان بالکل درندوں کی طرح تھا، اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں، لیکن اللہ کے نبی ﷺ کی بعثت کے بعد دنیا میں ایک بہار آگئی، مسلمانوں نے علم کو ایک نیا رخ دیا اور اس کی سرپرستی کی۔

قرآن مجید کی پہلی وحی میں یہ بات فرمائی گئی کہ:

{اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ٭ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ٭ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ٭ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ٭ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ} (العلق: ۵-۱)

(پڑھیے اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے بنایا، پڑھتے جائیے اور آپ کا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا)۔

اس وحی ربانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں علم کی ایک بہار نظر آنے لگی اور ہر حیثیت سے علمی ترقی ہوئی، اس سلسلہ میں مسلمانوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے کبھی بھی علم میں تفریق نہیں کی اور انہوں نے ہر حیثیت سے علم نافع کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، جس کے نتیجہ میں یہ دنیا گویا جنت بن گئی، لیکن جب دنیا میں علم کے اندر تفریق کا اصول اختیار کرلیا گیا اور مسلمانوں میں ایک انتشار برپا ہوا تو اس کے نتیجہ میں پوری دنیا کے حالات بدلنے لگے، اس میں سب سے بڑا مسئلہ یہ پیش آیا کہ علم کا جو رابطہ اسم رب اور اسلام کے اخلاقی نظام کے ساتھ تھا، وہ ایسا کٹا کہ اس کے بعد جو علم آیا اس نے انسانوں کو جانور اور خودغرض بنا دیا، آج دنیا میں جو علم سکھایا جاتا ہے، وہ علم خالص معاشی فائدے کے لیے سکھایا جاتا ہے، اب اس کا تصور تقریباً ختم ہوگیا کہ دنیا کو فائدہ پہنچانے کے لیے کوئی علم حاصل کیا جائے، آدمی صرف اپنے مفاد کے لیے علم حاصل کرتا ہے، حالانکہ یہ علم حقیقت میں دنیا کو صحیح رخ دینے کے لیے ہے، اس کے ذریعہ ان فوائد کو حاصل کرنا چاہیے جو اس دنیا اور انسانیت کی ضرورت ہیں، پھر سب سے بڑھ کر آخرت کی کامیابی کا راستہ بھی ہمیں اسی علم سے حاصل ہوتا ہے۔

علم ایک ایسا جوہر ہے کہ اس سے ہماری پوری زندگی مربوط ہے، اگر ہم علم سے مربوط ہیں تو ہماری زندگی بہتر راستے کی طرف جاتی ہے، لیکن اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ علم کا رخ غلط ہوگیا ہے، اب علم خالص دنیا کے فائدوں کے لیے حاصل کیا جاتا ہے، ایک زمانہ تھا کہ لوگوں میں علم کے ذریعہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا تصور پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہمارے برادران وطن اور ان قوموں میں بھی یہ تصور پایا جاتا تھا جن کے

پاس اسلام کا اخلاقی نظام نہیں ہے، لوگوں میں یہ ایک عام تصور تھا کہ علم کے ذریعہ صرف فائدہ اٹھانا مقصود نہیں ہے، لیکن آج میں آپ سے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے مدارس کا بھی مزاج بگڑ گیا ہے، آج ہمارے یہاں بھی جو علم دیا جا رہا ہے، وہاں بھی یہ تصور پیدا ہو گیا ہے کہ اس علم سے ہم کو کیا فائدہ ہوگا اور اس علم سے ہمیں کس حد تک دنیا ملے گی؟ ایک دور تھا کہ ان مدارس میں ہمارے علماء جو تعلیم دیتے تھے، چاہے وہ منقولات کے عالم ہوں یا معقولات کے، ان کے اندر زہد و اخلاص اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ایک جذبہ ہوتا تھا۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ مولانا حیدر علی صاحب رامپوریؒ کا یہ واقعہ اکثر سناتے تھے کہ جب بریلی میں انگریزوں نے عربک کالج قائم کیا تو لوگوں نے یہ بات کہی کہ اس وقت مولانا حیدر علی صاحب معقولات کے بڑے عالم ہیں، اگر وہ یہاں نہیں آئیں گے تو اس کالج کی اہمیت نہیں ہوگی، اس لیے انہیں رامپور سے یہاں لایا جائے، انگریزوں نے کہا کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں، ہم انہیں یہاں لے آئیں گے اور وہ جتنی تنخواہ چاہیں گے ان کو دی جائے گی، لیکن جب مولانا کے سامنے پوری بات رکھی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر میں وہاں چلا گیا تو میری پانچ سات روپئے تنخواہ بند ہو جائے گی، انگریزوں نے کہا کہ آپ کو وہاں اس سے زیادہ تنخواہ دی جائے گی، وہ بولے کہ اگر میں چلا گیا تو یہاں جو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی، انگریزوں نے کہا کہ ہم ان بچوں کو بھی لے جائیں گے اور وہاں ان سب کو وظیفہ دیا جائے گا، پھر وہ بولے کہ یہاں بیری کا ایک درخت ہے اور میں اسی کے پھل سے روزانہ ناشتہ کرتا ہوں، انگریزوں نے کہا کہ آپ کو یہی تازہ بیری روزانہ رامپور سے بریلی لے جانے کا بھی انتظام کر دیا جائے گا، پھر اخیر میں مولانا نے یہ بات فرمائی کہ سب ٹھیک ہے لیکن اگر قیامت میں اللہ نے کہا کہ تم نے یہ جگہ صرف اس لیے چھوڑی تھی کہ وہاں تمہیں پیسے زیادہ مل رہے تھے، تو میں اس وقت کیا جواب دوں گا؟ یہ سن کر انگریزوں نے کہا کہ اس کا جواب ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اس کا وقت کا طرز فکر کیا تھا، لیکن آج صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، مجھے خود یہ بات معلوم ہے کہ بعض سرکاری گرانٹ لینے والے مدارس میں شیخ الحدیث کی تقرری کے لیے دو لاکھ روپئے رشوت لیے گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ علم سراپا نافعیت ہے، چاہے یہ نافعیت دنیا کے ساتھ مربوط ہو یا آخرت کے ساتھ، جب تک علم کے ساتھ نافعیت ہے تب تک یہ علم حقیقت میں علم ہے، لیکن جب اس میں خود غرضی پیدا ہو جائے تو سچی بات یہ ہے کہ یہ علم جہالت ہے، اسی لیے کہنے والوں نے یہ بات کہی کہ آج جہالت پڑھ لکھ گئی ہے، ایک آدمی ڈاکٹر بنتا ہے تو وہ کڈنی چراتا ہے، ایک آدمی انجینئر بنتا ہے تو وہ اپنے طریقوں سے پیسے چراتا ہے، آپ دیکھ لیجیے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اس وقت خود غرضی کس طرح بڑھتی چلی جا رہی ہے، لگتا ہے کہ ایک آگ لگی ہوئی ہے۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اس وقت ہمارے مدارس سب سے بڑھ کر خطرے میں ہیں، ہمارے سامنے اندر کے مسائل بھی ہیں اور باہر کے مسائل بھی، یہ ہمارے لیے ایک بڑا لمحہ فکریہ ہے، اس وقت ہمیں سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ کر سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو کس طرح مضبوط کرنا ہے۔ یاد رکھئے! جب تک ہمارے اندر مضبوطی نہیں ہوگی اور ہم جب تک ہم مدارس کے مقصد کو نہیں سمجھیں گے، اس وقت تک ہم باہر کی مضبوطی کے ذریعہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ ہمارے اندر کی مضبوطی ہمارے دائرہ کی چیز ہے، ہم ہزار بار کوشش کریں اور باہر کی ساری اصلاحات کرنا چاہیں تو اس کا بہت کچھ فائدہ ہوگا اور ان شاء اللہ یہ کوششیں بھی نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہیں، لیکن سب سے بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں اپنے اندر کے ماحول کو بہتر بنانا ہے، ہمیں اپنے علم کے مقصد کو متعین کرنا ہے۔

مذہب اسلام میں علم کو اللہ کے نام سے وابستہ کیا گیا، لیکن آج اس علم کا رشتہ اللہ کے نام اور مذہب سے کاٹ دیا گیا ہے، آپ عیسائیت کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے، یہودیوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے، یا دوسرے مذاہب کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اس وقت دنیا ایک کسمپرسی کے عالم میں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف اس لیے ہے کہ علم کو مذہب سے کاٹا گیا ہے، جب سے علم کی یہ گیند عیسائیت کے پالے میں گئی اور سائنسی ترقیات ہوئیں، گویا انکشافات کا ایک بحر بے کراں سامنے آیا، اس کے نتیجہ میں دنیا ایسی مسحور ہوئی کہ لوگ بھول گئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟!

علم کی غلط تقسیم اس وقت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج انسان انسان کا دشمن ہے، قومیں قوموں کی دشمن ہیں اور ملک ملک کے دشمن ہیں، آج آپ کو کہیں بھی انسانیت نظر نہیں آئے گی، آپ اس ملک کو لے لیجیے جس کو کہا جاتا تھا کہ یہ پیار و محبت کا ملک ہے، آج یہاں کی

حالت یہ ہے کہ یہاں خودغرضی اس حدتک بڑھ چکی ہے کہ لاشوں پر سیاست ہوتی ہے، کتنی ہی جانیں چلی جائیں مگر ہمارا فائدہ ہونا چاہیے۔ میں صرف دوسروں ہی کو نہیں بلکہ اپنوں کو بھی کہتا ہوں، آج ہمارا حال یہ ہورہا ہے کہ ہم اپنے سگے بھائیوں کا گلا کاٹ دیں، ہم اپنے سگے رشتے داروں کے ساتھ کچھ بھی کردیں، بس ہمارا فائدہ ہونا چاہیے، ہمیں جائیداد ملنا چاہیے، اگر ہم وراثت کی صحیح تقسیم ہی کا مسئلہ دیکھیں تو غور کرنے کی بات ہے کہ ہمارے یہاں کس حد تک وراثت کی تقسیم صحیح نظام کے ساتھ جاری ہے۔ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ اگر اس کے پیچھے دیکھا جائے تو یہ سب صحیح علم سے انقطاع کا نتیجہ ہے اور اس علم سے دوری ہے جو علم ایک وراثت ہے سرکار دوعالم حضرت محمد عربی ﷺ کی، سب سے بڑھ کر دنیا کو علم کے جو راستے ملے، علم کی جو روشنی حاصل ہوئی اور اس کے ذریعہ سے ہدایت کے راستے کھلے، تو وہ حضور پاک علیہ السلام کا دیا وہ علم ہے جس کے نتیجہ میں دنیا کے اندر بہار آئی ؎

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے

ہمارے مدارس اسلامیہ، ہمارے علماء اور دین کے کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک پیغام ہے، وہ یہ طے کریں کہ علم کو نافعیت کے ساتھ جوڑنا ہے، وہ نافعیت دنیا کی ہو، وہ نافعیت آخرت کی ہو، لیکن خودغرضی نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ ہمیں صرف اپنا فائدہ نظر آئے، ہمیں صرف یہ نظر آئے کہ ہماری تنخواہ کہاں زیادہ ہوگی؟ ہمیں پیسہ کہاں زیادہ ملے گا؟ ظاہر ہے یہ علم کا راستہ نہیں ہے، یہ جہالت کا راستہ ہے، علم کا راستہ جب ہوگا جب ہم یہ دیکھیں کہ دوسروں کو فائدہ کیسے ہوگا، ہم وہ بہتر چیزیں بھی ایجاد کریں جو لوگوں کے نفع کی ہوں، آج یورپ نے اپنے انکشافات سے دنیا کو فائدہ بھی پہنچایا اور ہزار خرابیوں کے باوجود آج یورپ کی جو بالادستی ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ۔ اس میں بڑا حصہ نافعیت کا ہے، اس علم کے اندر اس نے جو نافعیت پیدا کی، اس سے دنیا فائدہ اٹھارہی ہے، اللہ نے دنیا کے لیے انہیں باقی رکھا ہے، اگر ان کے اندر یہ نافعیت نہ ہوتی تو ان کا نام ونشان مٹا دیا جاتا، ان کے اندر جو ظلم وستم ہے اور جو ہزار خرابیاں ہیں وہ ایسی تھیں کہ ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہتا، لیکن نافعیت ایک ایسا جوہر ہے کہ آج بھی وہ باقی ہیں۔

قرآن مجید میں ہے:

{فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ} (الرعد: ۱۷).

(بس جھاگ تو بے کار جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔)

یہ امت مسلمہ جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے امت نافعہ بنایا، آج واقعہ یہ ہے کہ امت مبغوضہ بن کر رہ گئی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ وہ اپنا فریضہ اور اپنی ذمہ داری بھول گئی، اللہ تعالیٰ نے اس کے اور علماء کرام کے ذمہ جو امانت سپرد کی تھی اس نے وہ فراموش کردی۔ آج کا یہ اجلاس ہمیں یہ پیغام دیتا ہے، ہمارے علماء کو بھی اور ہمارے عوام کو بھی کہ ہمیں نافعیت کا جو ایک خاص سبق پڑھایا گیا اور اللہ کے نبی ﷺ نے حضرات صحابہؓ کی جو جماعت تیار فرمائی، جس اخلاق کے ساتھ، جس کردار کے ساتھ، جس نافعیت کے ساتھ وہ دنیا میں پھیلی اور گویا اس نے پوری دنیا کو خیر وبرکت سے بھر دیا، اس کے نتیجہ میں لوگ ان کے گرویدہ ہوگئے، آج ضرورت اسی بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر یہ نافعیت پیدا کریں۔

ہمارے مدارس کے طلبہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کے پڑھنے کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان کو اچھا معاش مل جائے، ان کے پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے اندر نافعیت پیدا ہو، دنیا کے اعتبار سے بھی نافعیت ہو اور آخرت کے اعتبار سے بھی نافعیت ہو، اللہ نے ہمیں اسی لیے یہ زندگی دی کہ ہمیں آخرت کی کامیابی ملے، ورنہ دنیا کی یہ زندگی زیادہ دن کی نہیں، آدمی کتنا جی لے گا؟ لیکن اگر ہم دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں، تو یہ فائدہ پہنچانا اور اللہ کے بندوں کی خدمت کرنا، یاد رکھئے! یہ بھی معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے، اس سے بھی خدا ملتا ہے، کہنے والوں نے کہا کہ خدمت سے خدا ملتا ہے اور عبادت سے جنت ملتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے۔

ہمیں علم کو نافعیت سے جوڑنا ہے، یہ اس وقت کا ایک اہم مسئلہ ہے، اگر ہمارے مدارس میں یہ جذبہ پیدا ہوجائے، تو شاید دنیا کو ایک رخ مل سکے، پھر اس کے ساتھ اگر ہم اسلامک اسکول بھی قائم کریں تاکہ وہاں بھی نافعیت کی ایک فضا بنے۔ میں اکثر یہ بات کہتا ہوں کہ اس وقت دو چیزوں کو پانی اور ہوا کی طرح بالکل عام ہونا چاہیے، پہلی چیز تعلیم ہے اور دوسری میڈیکل لائن، نہ جانے ایسے کتنے پریشان حال لوگ ہوتے ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، اس وقت یہ دونوں چیزیں خالص بزنس بنالی گئی ہیں، اس کے نتیجہ میں آج پوری دنیا اور انسانیت کراہ رہی ہے، اس کی اصلاح کی ذمہ داری ہمارے علماء کی ہے، ہمارے مدارس کی ہے اور سب مسلمانوں کی ہے، ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ ہم اپنے اندر نافعیت پیدا کریں۔

.....بقیہ صفحہ ۱۴/ پر

تعلیم الحدیث

غیر اللہ کی قسم-ایک کبیرہ گناہ اور شرکیہ عمل

عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عن ابنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: "مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ فَقَدْ أَشْرَكَ". (أبو داود: ٣٢٥١)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائے، اس نے شرک کیا۔

عن عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رضي الله عنه قَالَ: سَمِعَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ وَأَنَا أَحْلِفُ بِأَبِي، فَقَالَ: لَا إِنَّ اللهَ يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ. قَالَ عُمَرُ: فَوَاللهِ مَا حَلَفْتُ بِهِ مُذْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَنْهَى عَنْهُ، ذَاكِرًا وَلَا آثِرًا. (البخاري: ٦٦٤٧)

ترجمہ: حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے سنا کہ میں اپنے باپ کی قسم کھا رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: خبردار، اللہ تمہیں اپنے باپ دادا کی قسم کھانے سے روکتا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اللہ کی قسم، جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس سے منع کرتے سنا، نہ میں نے کبھی ایسی قسم کھائی اور نہ کسی کی نقل کی۔

تشریح: قسم عظمت کے احساس اور تعظیم کے اظہار سے جڑی ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے غیر اللہ کی قسم کو شرک قرار دیا، کیونکہ تعظیمِ مطلق صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ سیدنا عمرؓ کا واقعہ اطاعت وانقیاد کی روشن دلیل ہے۔ ان کا یہ قول کہ پھر نہ کبھی خود ایسی قسم کھائی اور نہ کسی کی نقل کی، عملی توحید کا بہترین نمونہ ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مخلوقات کی قسمیں کھائی ہیں: سورج، چاند، رات، زمانہ، انجیر اور زیتون وغیرہ۔ یہ قسمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، اور وہ اپنی مخلوقات کا ذکر اپنی ربوبیت، قدرت اور وحدانیت کی دلیل کے طور پر کرتا ہے۔ بندے کے لیے ایسی قسمیں جائز نہیں۔

ہمارے معاشروں میں غیر اللہ کی قسمیں عام ہو چکی ہیں: "ماں کی قسم"، "تیری جان کی قسم"، "باپ کی قسم"، "تیرے گلے کی قسم"، "تیرے سر کی قسم"، وغیرہ۔ لوگ فرطِ محبت میں اس طرح کی قسم کھاتے ہیں۔ لیکن دل کی پاکیزگی اور ایمان کا تحفظ اس میں ہے کہ قسم کا درجہ صرف اللہ کے لیے رکھا جائے۔

ہمارے معاشرتی حالات میں یہ بات بھی توجہ چاہتی ہے کہ چونکہ ہم ایسے ماحول میں رہتے ہیں جہاں اکثریت اپنی مذہبی روایت میں متعدد ہستیوں اور مقامات کی تعظیم کرتی ہے، بعض اوقات اس کا اثر ہماری عام بول چال پر بھی پڑ جاتا ہے اور کچھ جملے بے خیالی میں قسم کے اسلوب میں آ جاتے ہیں۔ اہلِ ایمان کا طریقہ یہی ہے کہ اپنی زبان کو ایسے تمام الفاظ سے پاک رکھیں جو غیر اللہ کی تعظیم کا پہلو رکھتے ہوں، اگر کبھی زبان سے غلط قسم نکل جائے تو فوراً توبہ اور استغفار ضروری ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے واضح لکھا ہے کہ مخلوقات کی قسم کھانا، چاہے وہ کعبہ کی ہو، کسی بزرگ کی قبر کی ہو، سلطان کے انعام کی ہو، تلوار کی ہو یا کسی کے جاہ ومرتبہ کی شریعت میں ممنوع ہے، اہل علم کے راجح قول کے مطابق یہ محض ناپسندیدہ نہیں بلکہ حرام ہے اگرچہ امام احمد کا دوسرا قول مکروہ ہونے کا بھی ہے۔ (مجموع الفتاویٰ: ۳۵/ ۲۴۳)

ابن القیم نے اس مسئلے کو اور زیادہ کھول کر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ غیر اللہ کی قسم کبائر میں سے ہے اور جس نے اسے محض مکروہ کہا اس نے حقیقتِ شرع کو بہت کم کر کے پیش کیا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے "شرک" قرار دیا ہے، اور جب شارع اسے شرک کہے تو اس کا مقام عام کبائر سے اوپر چلا جاتا ہے۔

(إعلام الموقعین: ۶/ ۵۷۱،۵۷۲)

حافظ ابن حجر نے اس مسئلے کی اصل کو نہایت باریک نکتہ میں سمیٹ دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص جس چیز کی قسم کھاتا ہے اس میں وہی تعظیم محسوس کرنے لگے جو وہ اللہ کے لیے مانتا ہے تو یہ فعل حرام ہی نہیں بلکہ اعتقادی بگاڑ کی اس حد تک پہنچ سکتا ہے کہ انسان کو کفر تک لے جائے۔ یہی مفہوم اس حدیث کے اطلاق میں داخل ہے۔

(فتح الباري: ۱۱/ ۵۳۱)

فوائد: غیر اللہ کی قسم دل کے اندر تعظیمِ غیر کا بیج ڈالتی ہے اور توحید کے نور کو ماند کر دیتی ہے۔

صحابہ کرام نے اس سے ایسی نفرت کی کہ ایک بار ممانعت سن کر حضرت عمرؓ کی زبان پر پھر کبھی نہ آئی۔

قسم کا حق صرف اس ذات کو ہے جس کے ہاتھ میں عزت، رزق اور تقدیر سب کچھ ہے۔

ائمۂ دین نے اسے کبائر اور شرکِ لفظی قرار دے کر اس کے خطرے کو دوٹوک واضح کیا ہے۔

توحید کی اصل یہی ہے کہ زبان بھی اللہ کی عظمت کے آگے مکمل جھک جائے اور کسی اور کا نام قسم میں نہ آئے۔

فرزند ندوہ

مولانا محب اللہ لاری ندویؒ

ایک مخلص ومتواضع اور شفیق ومہرباں دار العلوم ندوۃ العلماء کے پاسبان

مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

وہ بھی کیا دن تھے! قریب ساٹھ برس پہلے کا زمانہ، دنیا کی ہزاروں سال پرانی تہذیب، اقدار اور تمدنی رکھ رکھاؤ کا دم واپسیں۔ اور ایک بالکل جدید مشینی تکنیکی اور میکانکی دنیا کی آمد۔ جہاں کسی بھی علاقہ اور زبان حتی کہ مذہب کے پرانے نقوش کی بھی گویا جگہ نہیں۔

ہماری نسل کا انتخاب خدا جانے ایسے انقلابی اور تہذیبی موت وحیات کے زمانہ کے لیے کیوں ہوا؟

۱۹۶۷ء کا ندوہ اس انقلاب سے الگ کیوں کر ہوسکتا تھا، وہ ندوہ جو ساٹھ ستر سال سے گومتی ندی کے کنارے سست رفتار موجوں میں خود کو دیکھ کر جاگتا اور پھر شام اودھ کی خاموش خنکیوں میں رات کی چادر اوڑھ لیتا۔ بیگھوں زمین ایک سرے پر ایک محل نما عمارت، درمیان میں ایک نہایت نازک خوبصورت سا اللہ کا گھر اور دوسرے سرے پر ایک زوال پذیر فن تعمیر کی یاد دلاتی دو منزلہ عمارت۔ درمیان میں کہیں کہیں عرب بادیہ نشینوں کے خیموں کی طرح یا پھر ہجوم نخیل کے کسی مرقع کی مانند نصف صدی سے زیادہ کی دل فروز فضاؤں اور سینہ سوز نواؤں کی یاد دلاتے ہوئے مناظر۔ ۱۹۶۷ء کے ندوہ میں پہلی بار نئی فضاؤں کی سرسراہٹ کا اعلان تب ہوا جب نئے دور کے نئے بچوں کے لیے سلیمانیہ ہاسٹل اور مدرسہ ثانویہ کی بناو تعمیر نے اپنے اپنے سنگ بنیاد تلاش کر لیے۔

ہم کہ دینی تعلیمی کو نسل کی نسل بچانے کی جدوجہد کا نتیجہ تھے۔ ندوے کے نئے دور کے باب اول سے داخل ہونے والوں کی فہرست میں شامل کر دیے گئے۔

اب کیا بتائیں، رواق سلیمانی کے زیر تعمیر کمرے اور مدرسہ ثانویہ کے سفال پوش وجود کے عارضی درجات اور ان کے درمیان مولانا سید مرتضی حسینی، مولانا وجیہ الدین اور مولانا شمس الحق سے مدرسہ ثانویہ کے نہایت شفیق پرنسپل ماسٹر محمد حسن عرشی، مولانا انوار، مولانا ہارون رشید جیسے اساتذہ کے درمیان بچپن کو لڑکپن میں بدلتے دیکھنے بلکہ محسوس کرنے کی کیفیتوں کو کیا نام دیا جائے۔ اب کہنگئی عمر شاید ہی ان کیفیتوں کی لذت سے قلم کی زبان کو آشنا کرا سکے۔

ہم تو چھوٹے تھے، ہماری ثانویہ والی دنیا بھی بڑی محدود تھی، بڑی بورڈنگ کے طلبہ بڑے درجات کے تھے، اس لیے واقعتا بڑے درجے والے تھے۔ دار العلوم کی عمارت جتنی پرشکوہ اور باعظمت تھی اس سے زیادہ وہاں کی جمعیۃ الاصلاح کے عہدے دار اور پروگرام تھے، اس طرف جانے کی ہمت ہم کو کیا ہوتی، بس کچھ بزرگوں کو کبھی کبھی آتے جاتے دیکھتے، معلوم ہوا کہ یہ مولانا اسباط صاحب ہیں، ایک بزرگ مولانا عبد الحفیظ بلیاوی بھی شبلی ہاسٹل کی جانب آتے جاتے دکھائی دیتے، اس وقت کون بتاتا کہ یہ علم و فضل کے چلتے پھرتے پہاڑ ہیں۔

اعدادیہ سے درجہ اول تک پہنچتے پہنچتے کچھ اور بزرگوں کے سائے ہمارے وجود کے آس پاس سے گذرنے لگے، ان میں مولانا محمد اویس نگرامی اور مولانا محمد اسحاق سنبھلی سب سے زیادہ نگاہوں کے مرکز بن جاتے تھے۔ مولانا نگرامی اپنے لباس اور لکھنوی تہذیب کی شاندار تصویر کی وجہ سے اور مولانا سنبھلی اپنی زلفوں اور فوجی قد و قامت اور اس سے بھی بڑھ کر فجر کی امامت میں نہایت دلکش اور پرسوز تلاوت کی وجہ سے۔

۱۹۶۷ء کی یادوں کی یہ کچھ تصویریں ہیں، تب ہم کو اس کی خبر ہی نہیں تھی کہ ندوے کے طلبہ کی اصل پہچان کیا ہے؟ یہ پہچان تو بعد میں معلوم ہوئی کہ ''ندوہ کا طالب علم شرافت، ذہانت، سنجیدگی، شائستگی، خودداری، بڑوں کا پاس ولحاظ، استادوں کا ادب کرنے والا ہوتا ہے''۔ ہاں یہ احساس تو پیدا ہو چلا تھا کہ بڑے طلبہ چھوٹوں کو بالکل نظر انداز نہیں کرتے اور خود چھوٹے طلبہ میں اتنی بے باکی نہیں کہ وہ بڑے طلبہ سے آنکھیں چار کر لیں اور سب سے بڑھ کر یہ احساس جاگنے لگا تھا کہ بڑے طلبہ ایسے ہیں کہ باہر کی بڑی بڑی شخصیتوں کے سامنے ان کی آنکھیں جھپکتی نہیں اور کوئی وزیر کبیر یا بڑا تاجر یا امیر ہو، اس کی عزت تو ٹھیک لیکن اس کا رعب طاری نہیں کرنا ہے۔

اب پتہ نہیں یہ سوچ سب میں تھی یا نہیں۔ نہیں بھی تھی تو کوئی حرج کی بات نہیں تھی، ثانویہ کے نو واردوں کو اس سے کیا مطلب کہ دار العلوم میں مولانا معین اللہ ندوی، مولانا عبد الماجد ندوی، مولانا شفیق الرحمان ندوی، مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا حبیب الرحمن سلطان پوری، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی، مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی، مولانا تقی الدین

ندوی، مولانا منظور ندوی، مولانا بشیر ندوی جیسے اساتذہ کا مرتبہ ومقام کیا ہے۔ ثانویہ کے نووارد طالب علم کو کیا خبر کہ ندوہ کے ناظم کی شہرت کہاں کہاں پہنچ رہی ہے۔ ہاں مہتمم صاحب کی پہچان لیے ہوئے، مولانا ابوالعرفان ندوی کے بھاری بھرکم اور نہایت رعب دار وجود سے البتہ خوف پنپتا نظر آتا لیکن یہ خوف پوری طرح غالب آتا اس سے پہلے معلوم ہوا کہ مولانا اسحاق سندیلوی مہتمم ہوگئے ہیں، ان کی اہمیت دفتری کاغذوں پر ان کے دستخط سے تھی۔ اس میں یہ اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ قائم مقام مہتمم کیوں لکھا جاتا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ اعدادیہ اور درجہ اول عربی کی زندگی سوالوں کی زندگی تھی ہی نہیں۔

ہمارے ذہنوں میں یہ سوال کیوں آتا کہ ندوے کے مہتمم کیسے کیسے لوگ ہوئے، یا یہ کہ مہتمم اور صدر مدرس دو الگ عہدے تھے تو ان میں برتر کون تھا؟

شاید دوم سوم عربی میں یہ شعور غنچۂ ناشگفتہ کی شکل اختیار کرتا، مگر پھر وقت کی ایک کروٹ نے اچانک لکھنو سے بھوپال یا ندوے سے تاج المساجد یا اصل سے فرع تک پہنچنے کے مرحلے سے آشنا کر دیا، ندوہ کے دو ابتدائی برسوں میں عرشی صاحب کی مزاج شناسی بلکہ بلند مزاجی نے طلبہ کے جلسوں میں اقبال کے اشعار کا رس گھول رکھا تھا، ایک طالب علم معین اختر کے ترنم سے سرشار ہم کو کلام اقبال کے معنی سمجھنے کی ضرورت بھی کیا تھی، ہم کیا سمجھتے کہ:

کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

میں مقام خودی اور پھر اس کے راز کا فاش ہونا کیا بلا ہے۔

بلا بلکہ ابتلا تھی تو یہ کہ لکھنو سے سینکڑوں میل دور بلکہ اپنوں سے غیروں تک کے خدا جانے کتنے فاصلوں والی جلاوطنی کی سزا مل چکی تھی۔

بھوپال کی زندگی سے پیغام یہ ملا کہ کبھی اگر فرصت کا قلم اور یادوں کا کاغذ ملے تو اپنی کہانی اپنے ہی قلم سے لکھی جاسکتی ہے، خامۂ حق نے انسان کی جبیں شاید اسی لیے خالی رکھی ہے، بہرحال بھوپال کی سرزمین نے پیروں کو سنبھالا دیا اور اس طرح کہ سوم عربی سے ہفتم عربی تک گویا سیر ہفت افلاک کا مزہ آگیا۔

اتنی لمبی اور بظاہر بے ضرورت تمہید میں اصل عنوان کے ظاہر کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

کہنا صرف یہ تھا کہ ندوہ میں ہجرت سے پہلے کے دور میں مسند اہتمام پر فائز دو شخصیتوں کے نام سے کان آشنا ہوئے تھے، ایک تو مولانا ابوالعرفان خاں ندوی اور دوسرے مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندوی لیکن یہ دونوں قائم مقام کے حروف زائد کے ساتھ مسند اہتمام پر متمکن ہوئے۔

۱۹۶۹ء میں بھوپال میں ہجرت کا پہلا سن پورا ہو رہا تھا کہ معلوم ہوا کہ مولانا محب اللہ ندوی نام کے ایک بزرگ نے ندوہ کے سجادۂ اہتمام کو مفتخر کیا ہے اور اس شان سے کہ چلی آرہی مہتمم سے پہلے قائم مقام والی شناخت بالآخر درکنار کردی گئی ہے۔

پھر خبر آئی کہ ندوہ میں طلبہ کا کسی معاملہ کی وجہ سے اضطراب' انتشار اور نعرۂ انقلاب میں بدل گیا، اصل وجہ کیا تھی اب تک نہ معلوم ہوئی نہ جاننے کی خواہش ہوئی، بعد میں بس اتنا معلوم ہوا کہ موج بلا تیز اور تند تھی جو سر سے گذری، لیکن قیامت نہ بن سکی، فساد کے فرو ہونے میں اور آگ کو سرد کرنے میں جن بزرگوں کی مدبرانہ حکمت عملی کارگر ثابت ہوئی، ان میں مولانا محب اللہ ندوی صاحب کے فعال کردار کا ذکر خصوصیت سے زبانوں پر جاری ہوا۔ اس وقت سماعتوں نے جس انداز سے ان کے بارے میں تصور سازی کی، اس سے عالم خیال میں مہتمم صاحب کی ایسی تصویر جس میں رعب اور قوت اور ہیبت کے رنگ نمایاں تھے، بننے میں دیر نہیں لگی۔

۱۹۷۳ء میں بھوپال نے ہم کو الوداع کہہ دیا، ہم اپنے پانچ سال کے قیام میں بھوپال کی محبتوں کی بارش میں اس طرح نہاتے رہے کہ زندگی کا آسمان لگا صرف بھوپال ہی پر سایہ فگن ہے، اس لیے ہم کبھی یہ نہیں کہہ سکے کہ ہم نے بھوپال کو الوداع کہا، خیر یہ الگ جذبات کی دنیا ہے، کہنا یہ ہے کہ ایک بار پھر گھر واپسی والی کیفیت میسر آئی، ندوہ تو وہی تھا لیکن پانچ برس پہلے اگر ہم نے عنفوان شباب والے باب سے داخلہ پایا تھا تو اب ندوہ اپنی زندگی کے عین عالم شباب میں نظر آیا، گومتی ندی کی قربت جو سیلابی اذیتوں کا بڑا سبب تھی، اب اطمینان بخش فاصلوں میں بدل چکی تھی۔ جغرافیائی تغیر، روئے زمین کے خط وخال کی علامت ہے، ندوے کا جغرافیہ اس حقیقت کا گواہ بن چکا تھا۔ یہی نہیں تاریخ جو عروج وزوال کی لکیریں بناتی مٹاتی رہتی ہے، اس نے ندوے کی قسمت کی تحریروں میں نیا رنگ بھرنا شروع کر دیا تھا۔ اب ندوہ اپنی عمارتوں کی دلآویزی سے زیادہ ناظم ندوہ کی شخصیت کی جہانگیری سے پرکشش ہونے لگا تھا، طلبہ کی کثرت تھی، عمارتوں کی وسعت تھی اور سب سے بڑھ کر اساتذہ اور نظام تعلیم کی زیادہ بہتر لیاقتوں اور صلاحیتوں کی عملداری تھی، ان سب کے پس منظر میں مہتمم صاحب کی طبیعت اور مزاج کی خاموشی سب سے زیادہ بولنے والی تھی۔ نظم ونسق کی ترتیب، وقت اور معمولات کی ہم آہنگی،

زبان حال سے واضح طور پر بتا رہی تھی کہ درجہ، کمرہ اور حجرہ یکساں طور پر اگر آباد ہیں، تو اس کا اصل سبب اہتمام کا وہ دفتر ہے جہاں کوئی ہے، جس نے شاہ ولی اللہ کے بیان تدبیر مدن کو زیادہ ہی شوق سے دل و دماغ میں بسالیا ہے، تصور نے اس شخصیت کا ہیولیٰ بھی انہی نقوش سے تیار کیا، جن کے مظاہر سابقہ مہتمم حضرات کی شخصیتوں سے سامنے آچکے تھے۔

قدآور، وجیہ، پررعب اب تک انہی صفات کا دیدار ہوا تھا، لیکن جب مہتمم صاحب پہلی بار نگاہوں کے افق پر طلوع ہوئے، تو بڑی محنت و مشقت اور زاویوں کے الٹ پھیر کے بعد نظر آنے والے چاند کی طرح ایک نحیف ناتواں وجود نے ہمارے تصورات کی دنیا ہی دھندلی کردی، لیکن آہستہ آہستہ دارالاقامہ، تعلیمی درجات، مسجد کی آبادی، نظام مطبخ کی درستگی اور طلبہ میں جمعیۃ الاصلاح جیسی تربیت گاہوں کی رونق اور اساتذہ اور طلبہ کے درمیان محبت و شفقت اور غیر تدریسی انتظامات میں حسن سلیقہ کی قدرت نے بتایا کہ **والقمر قدرناہ منازل** کے لفظوں میں عمومی اور مجازی مفہوم اور کیا ہوسکتے ہیں۔ چاند اور مدھم چاند کی تمثیل نے سرگوشی کی کہ **لاالشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر** کی بلاغت کو محدود کیوں کیا جائے۔

۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۵ء تک ہم نے مولانا محب اللہ ندوی کے عہد اہتمام میں سانسیں لیں، ان سانسوں کے لیے صحت بخش آکسیجن کی فراہمی میں مولانا کے دور کے احسان کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، ہم کو بھولے سے بھی یاد نہیں کہ مسجد اور دفتر کے معمولات میں مہتمم صاحب نے کبھی بھول جانے کا عمل یاد دلایا ہو، خاموشی، سرافگندگی، سریع السیری اور ظہور و نمود کی انسانی خواہشوں سے دوری کی پہچانوں نے ان سے قریب نہیں کیا تو دوری کو بھی روا نہیں رکھا۔ دو سال گذر گئے، ہماری ہر طالب علمانہ حرکت پر ان کی نظر تھی، اس کا علم بھی نہیں ہونے دیا، کبھی کبھار کسی درخواست پر منظوری کی ضرورت ان کے دستخط کی تلاش میں خود ان کو پانے کا موقع دیتی رہی، شاید ایک ہی دو بار دفتر کے علاوہ ان کے گھر پر حاضری، بلکہ حاضر ہوں کہ آواز پر صف بستگان میں شامل ہونے کی نوبت آتی، تو ان کی میز پر اخبار پانیر کی موجودگی بتانے لگتی کہ بظاہر ایک عام مولوی صورت کے اندرون ندوہ کا مقصد پوشیدہ ہے۔ یہ وجود اگر پوچھا جاتا تو بتاتا کہ ان کے اندر کا ندوہ ہمیشہ زندہ رہا، وہ سخت ترین حالات میں ندوہ کی فکر سے الگ نہیں رہے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ اودھ کے کسی قصبے کے روایتی مولوی نما مسلمان نظر آنے والے مہتمم صاحب نے مسلم یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں اس وقت ایم۔اے کیا تھا جب ایم اے کرنا بہت خاص بات تھی۔ علی گڑھ کی طالبانہ زندگی، نگاہ نرگس کی سرشاری اور گیسوئے سنبل کی گرفتاری کے لیے بھی نشان امتیاز رکھتی ہے، مگر مہتمم صاحب اس زمانہ میں بھی وضع قطع اور عقیدہ وعمل کی آزمائش میں آسانی سے گزر گئے۔

حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ بتاتے رہے کہ وہ ان کے آخری درجات کے ساتھی تھے، طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ وہی تھے جو زندگی کے آخری درجات میں اپنے طلبہ کے سامنے تھے۔ متواضع، باوقار اور یکسو۔ مولانا محمد عمران خان ندوی کی داستان میں ان کا وجود ندوہ کے مہمات مسائل کے حل کرنے والوں کی شکل میں مذکور ہے۔ شاید اسی لیے مشیت الٰہی نے ان کو اس دور کی دیکھ بھال کے لیے منتخب کیا جب ندوے کے پچاسی سالہ جشن کی ضرورت محسوس کی گئی، اس جشن نے ہندوستانی مسلمانوں پر جو بھی اثر ڈالا اس سے قطع نظر خود تحریک ندوہ کی تبلیغ وتفہیم وتوصیف میں اس نے ایک نئے عہد کے در کھول دیے۔ ساتھ ہی مہتمم صاحب کو اس نئے انقلاب کے خاموش نقیب کی ناقابل فراموش عزت عطا کردی۔

عزت تو ہم طلبہ کی قسمت میں آئی کہ ایسے مہتمم کے دور اہتمام کا حصہ بننے کی توفیق ملی، فضیلت دوم یعنی ندوے کی تعلیمی زندگی کے اپنے آخری سال ۱۹۷۵ء میں چلتے چلتے وہ سماں بھی اچانک رونما ہوا جو کسی بھی طالب علم کے لیے یاد رکھنے کے لائق نہیں، جمعیۃ الاصلاح کے ناظم ہونے کی خواہش کسی بھی طالب علم کے لیے باعث جرم نہیں، دارالاقامہ کی زندگی ایسے حوصلوں کو قدرتاً پروان چڑھاتی ہے، ہم اس سے مستثنیٰ کیوں کیے جاتے، دوستوں نے ماحول بنایا تو دوسرے آرزو مندوں نے بھی قسمت آزمائی کی تیاری کی، بات مقابلے تک آپہنچی اور مقابلہ کے آخری فیصلے میں بس ایک دن رہ گیا تھا کہ دفتر اہتمام سے طلبی ہوئی اور پھر جو ہوا وہ یہ کہ نظامت کا مقام تو الگ، اب دارالاقامہ میں رہنے کی اجازت بھی نہیں، اخراج کا فیصلہ صادر ہوا، مہتمم صاحب کی ذکاوت حس کا اس وقت تو نہیں، بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ پانچ چھ برس پہلے کے سانحۂ بغاوت کا تلخ اثر تھا۔ دودھ کا جلا ماٹھا پھونک پھونک کر پینے کی مثل یوں ہی تو عام نہیں ہوئی۔ سزا ملنی تھی مل کر رہی، لیکن اصل سزا تو یہ احساس تھا کہ ایک محبت کرنے والے کے دل کی جراحت کا ذریعہ ہم کیوں بنے؟ بعد میں جو ہوا اس کے بیان کی یہاں اب کیا ضرورت؟ مگر دار المصنفین سے جب پہلی بار ندوہ میں حاضری ہوئی تو عرق

انفعال کے قطروں کی نمائش کے لیے مہتمم صاحب کے حضور پیش ہونا ہی تھا، حاضری ہوئی تو اب ایک مجسم شفقت کا سامنا تھا، پیار سے پوچھا بلکہ بتایا کہ امتحان ہال میں تم پر خاص نظر رکھی جاتی تھی کہ آخر تم پہلی پوزیشن والی کامیابی کے لیے کیا حرکت اپناتے تھے، انتہائی نگرانی کے باوجود تم بچ کیسے جاتے تھے؟ جواب میں عرض کیا گیا کہ کچھ نہیں، تمام تر آزادی اور بے فکری کی نمائشوں کے ساتھ درجہ میں حاضری کی پابندی اور ایک دو مہینے پہلے مذاکروں کی محنت کی برکت، امتحان کی گھڑی میں شامل حال رہتی، سن کران کے چہرے پر مسرت واطمینان کے جوسائے لہرائے۔ لگا کہ تین سال کا سارا قصور خراج عقیدت کی شکل میں قبول کرلیا گیا۔

۱۹۹۳ء میں مہتمم صاحب ندوہ کی دنیا اور اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے، لیکن حقیقتاً وہ اس صف اہتمام میں آج بھی زندہ وتابندہ ہیں، جو مولانا حفیظ اللہ، مولانا شیر علی، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولانا امیر علی، شیخ محمد عرب اور مولانا حیدر حسن ٹونکی، مولانا محمد عمران خان ندوی، مولانا محمد اسحاق سندیلوی اور مولانا ابوالعرفان ندوی جیسے علم وحکمت اور انتظام وانصرام کی ہستیوں سے آج بھی رشک کہکشاں ہے۔ اپنے اور آنے والے ہر مہتمم کے لیے وہ درحقیقت ایک مثال بن گئے اور ان کے لیے تو وہ آج بھی زندہ ہیں جنہوں نے واقعی ان سے قریب ہونے، فائدہ اور فیض اٹھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، دوسری طرف ان کے لیے بھی زندگی کا پیغام ہے جنہوں نے ان کو پہچاننے میں کوتاہی کی اور جیسی قدر کی جانی تھی نہیں کی، وانا منھم لیکن یہی حسرت شاید برکت کا سبب بھی بن جائے۔ لعل اللہ یرزقنی صلاحاً۔

❁❁❁

.......بقیہ صفحہ ۹/کا

اللہ تبارک وتعالیٰ اس اجلاس کو قبول فرمائے، اللہ کا فضل ہے کہ جن حضرات نے یہ اجلاس منعقد کیا' یقیناً یہ ہمارے حضرت مولانا محمد عمران خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اخلاص ہے اور ان کی وہ نیک نیتی اور وہ قوتِ عمل ہے جس کے نتیجہ میں اللہ نے اتنی بڑی مسجد تیار فرمائی، اللہ نے ان کو اس کے لیے قبول کیا، اللہ کا فضل ہے کہ انہوں نے بہت سے دین کے کام کیے اور یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ان کے خاندان کو بھی دین کے لیے قبول فرمایا، اللہ تبارک وتعالیٰ مولانا حسان صاحب کو قبول فرمائے جو اس مشن کو لے کر کھڑے ہیں، اللہ ان کو صحت وقوت عطا فرمائے، الحمد للہ آگے بھی نسلیں تیار ہیں۔ میں ان حضرات کا بہت ہی مشکور ہوں، میں ان کی محبت میں یہاں حاضر ہوا، عرصے سے میری طبیعت ناساز تھی لیکن ان حضرات کی نسبت سے یہاں آکر بڑی فرحت ومسرت ہوئی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس اجلاس کو قبول فرمائے، اس کے بہتر نتائج پیدا فرمائے، اصل مسئلہ نتائج کا ہوتا ہے، پھر سب سے بڑھ کر اللہ کے لیے آدمی جو قدم بڑھاتا ہے، اللہ اس کو قبول کرلیتا ہے اور اس کے بہتر سے بہتر نتائج سامنے آتے ہیں، میں مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ لوگوں کے اندر ایک نیا ذوق پیدا ہوگا اور ہمارے اندر نافعیت ان شاء اللہ پیدا ہوگی، اللہ کے نام کے ساتھ جب علم مربوط ہوتا ہے تو اس کے اندر نافعیت پیدا ہوتی ہے اور جب اللہ کے نام سے علم کو کاٹ دیا جائے تو نافعیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے اور ہماری زندگی کے اندر اس کی روشنی پیدا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

❁❁❁

نقشِ تمنا

محمد سمعان خلیفہ ندوی، بھٹکل

خدا اور نبی کے وفادار ہیں ہم
شریعت کے ہر آن انصار ہیں ہم
زمانے کی ظلمت میں انوار ہیں ہم
خوشا حسنِ گفتار و کردار ہیں ہم
برائی سے ہر لحہ بیزار ہیں ہم
بھلائی کے ہر دم طلب گار ہیں ہم
بقا علم کی ہم جیالوں سے ہوگی
مدارس کی عظمت کا مینار ہیں ہم
عمل، جستجو، عزمِ راسخ، محبت
خودی، عشق ومستی کے اسرار ہیں ہم
ادب اور انسانیت کے جہاں میں
گلوں کا تجمل ہیں گلزار ہیں ہم
بنائے اخوت کے معمار ہیں ہم
بنی نوعِ انساں کے غم خوار ہیں ہم
امیدوں کا مرکز، توجہ کا محور
کہ نقشِ تمنا کا دیدار ہیں ہم
خدا کی محبت سے آباد ایسے
کہ شیطان سے محوِ پیکار ہیں ہم
نظامِ محمد سے ہے پیار ایسا
شہِ دیں پہ مرنے کو تیار ہیں ہم
ہدایت کے گلشن کے ہم خوشہ چیں ہیں
جہاں میں غزالانِ سیار ہیں ہم
تلاطم ہو دریا میں گر زندگی کے
شریعت کی کشتی کی پتوار ہیں ہم
مقاصد کو پانے کی دھن ہے کچھ ایسی
مثالِ صبا تیز رفتار ہیں ہم
یہ وعدہ ہے سمعاںؔ تجھ سے ہمیشہ
مقابل میں باطل کے یلغار ہیں ہم

تعلیماتِ دین

لباس-قرآن وسنت کی روشنی میں

مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اسلام نے لباس سے متعلق کچھ رہنما ہدایات دی ہیں، تاکہ مسلمان اس معاملے میں بھی صحیح اعتدال وتوازن کو قائم رکھیں۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ لباس انسان کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، ایک شریف وسنجیدہ انسان اپنی جامہ زیبی سے بھی بہت حد تک پہچانا جاتا ہے، اوٹ پٹانگ بے ڈھنگا لباس کوئی سلیم الفطرت انسان پہن ہی نہیں سکتا۔

اسلام سے قبل لباس کا دینی تصور

تاریخ سے واقف انصاف پسند شخص اس کی گواہی دے گا کہ ’’دین اور اہل دین‘‘ کا صحیح تصور نبی اکرم ﷺ نے پیش فرمایا، آپ ﷺ سے پہلے رہبانیت، کہانت اور غلط قسم کی ریاضت کی بنا پر ہر طرح کی بے ترتیبی اور بسا اوقات بے لباسی تک کو دین قرار دیا جاتا تھا، راہبوں اور جوگیوں نے ایسی اوٹ پٹانگ قسم کی چیزیں مذہب کے نام پر ایجاد کر رکھی تھیں کہ بے چارے نہ دین کے رہے تھے نہ دنیا کے۔ گندگی اور میل کچیل کو مذہب سے اس طرح جوڑ دیا تھا کہ ’’مذہبی شخصیت‘‘ سے مراد وہ ہوتا جو میلا کچیلا، بکھرے بالوں والا، پراگندہ اور نہایت درجہ بے ترتیب ہو۔ بعض مشرکین برہنہ طواف کرتے اور اسے خاص قسم کی دین داری قرار دیتے۔ بعض راہب مہینوں بلکہ بسا اوقات سالوں پاکی وصفائی سے دور رہتے اور جسمانی گندگیوں کو روحانی ترقی کی معراج سمجھتے۔

یہ رسول اکرم ﷺ تھے جنھوں نے دنیا کے سامنے صحیح دین کا نقشہ پیش فرمایا، اور اہل دین کا صحیح نمونہ لوگوں کے سامنے رکھا؛ اور اس کا اعلان فرمایا کہ دین نام ہے سراسر پاکیزگی، نفاست اور ہر قسم کی گندگی سے دور رہنے کا۔ اولین وحی جس میں آپ ﷺ کو کھلم کھلا دعوت پیش کرنے کا حکم پیش کیا گیا وہ سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات تھیں۔ یہ آیات علم و عمل، عقیدہ واخلاق، ظاہر وباطن، دعوت واصلاح اور معاشرت وآداب کے لحاظ سے بنیادی تصورات پیش کرتی ہیں؛ {يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ، وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ} (اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھو اور آگاہ کرو۔ اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کرو۔ اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ گندگی سے بالکل دور رہو۔ اس غرض سے احسان نہ کرو کہ بہت بدلہ چاہو۔ بس اپنے رب کے لیے ڈٹ جاؤ)۔

ان آیات میں {وثیابک فطھر} اور {والرجز فاھجر} نے (جن پر آپ ﷺ پہلے ہی سے عمل پیرا تھے) ہر قسم کی رہبانیت، جوگی پن اور مذہب کے نام پر قائم غلط قسم کے تصورات کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی۔ اس کا واشگاف اعلان ہوا کہ جس دین کی دعوت دی جارہی ہے وہ روح وجسم کے ساتھ ساتھ لباس کی پاکیزگی پر بھی بے پناہ زور دیتا ہے، اور ہر قسم کی ظاہری وباطنی آلودگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی دعوت رکھتا ہے۔

لباس اور عبادت

اسی لیے دین کے اہم ترین رکن ’’نماز‘‘ کے لیے لباس کی ایک خاص حد کو شرط قرار دیا گیا، اور بہتر سے بہتر لباس زیب تن کرنے کی دعوت دی گئی؛ ارشادِ خداوندی ہے: {يا بني آدم خذوا زينتكم عند كلِّ مسجدٍ} (اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کیا کرو)۔ اس فرمان کے ذریعے اللہ رب العزت نے عبادت کے ساتھ خوش لباسی کو ہمیشہ کے لیے وابستہ کردیا۔ یہ مبارک آیت قرآنِ کریم میں قصۂ آدم وابلیس کے بعد آئی ہے؛ ابلیس حضرت آدم کو بے لباسی کے ذریعے بے حیائی کے فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ یہی کام وہ اولادِ آدم کے ساتھ بھی کر رہا ہے۔ اللہ نے اس کا علاج یہ کیا کہ شرم گاہ کی حفاظت کو لازم قرار دیا۔ اور اپنی عبادت کے وقت اور زیادہ زیب وزینت اختیار کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ بات ذہن ودماغ میں ہمیشہ کے لیے پیوست ہوجائے کہ عبادت کا تصور لباس کے بغیر ممکن نہیں۔ بے لباسی کے ساتھ عبادت کا تصور مشرکانہ، راہبانہ اور جوگیانہ تصور جس کا اللہ کے دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

نمازوں میں جمعہ کی نماز کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس نماز کے لیے نبی اکرم ﷺ نے غسل، عمدہ پوشاک اور خوشبو لگانے کی جو تاکید فرمائی ہے وہ ایک طرف آپ ﷺ کے ذوق ومزاج کو عیاں کرتی ہے تو دوسری طرف اللہ کی بندگی کے ساتھ خوش لباسی، جامہ زیبی، شائستگی اور پاکیزگی و لطافت کے تعلق کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

لباس سے متعلق اسلام کے رہنما اصول

اسلام اپنی تعلیمات میں پوری انسانیت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ لباس سے متعلق بھی اس نے کچھ دائمی وآفاقی اصول رکھے ہیں، ان اصولوں کو سامنے رکھ کر کوئی بھی قوم اپنی اپنی پسند کا لباس اختیار کرسکتی ہے۔ اسلام نے لباس کی کوئی خاص قسم یا ہیئت متعین نہیں کی ہے، اس بنا پر ہر دور میں ہر قوم کے لیے (جو مسلمان ہو) اسلامی اصول

کے لحاظ سے شائستہ اور تہذیب پر مبنی لباس اختیار کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

اسلامی لباس کے بنیادی اصول یہ ہیں

۱-لباس ساتر ہو، یعنی مرد وعورت کے لیے جسم کے جن حصوں کو ڈھانپنا ضروری ہے اسے مکمل ڈھانپنے والا ہو، یہی لباس کا اصل مقصد ہے۔ اسی سے انسان جانوروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ لباس اگر قابل ستر حصوں کو بھی نہ ڈھانک سکے تو اس میں اور بے لباسی میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا: {یا بني آدم قد أنزلنا عليكم لباساً يواري سوآتكم و ريشاً} (اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمھاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور تمھارے لیے باعث زینت بھی ہے)۔

۲-ہر قسم کے میل کچیل اور گندگی سے پاک ہو؛ قرآن کریم کی مبارک آیت "وثيابك فطهر" (آپ اپنے کپڑوں کو پاک و صاف رکھیں) اس کی تاکید کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے پاک و صاف بندے بہت پسند ہیں؛ {والله يحب المطّهرين} (خوب پاک وصاف رہنے والے اللہ کو بہت پسند ہیں)۔ لباس کو نجاست سے پاک رکھنا ضروری، اور میل کچیل سے صاف رکھنا شریعت کے نزدیک نہایت پسندیدہ ہے۔

۳-ٹخنوں سے نیچے نہ ہو؛ یہ مردوں کے لیے تکبر کی علامت ہے، اس سے تکبر پیدا ہونے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ حدیث میں ایسے شخص کے بارے میں سخت الفاظ وارد ہوئے ہیں؛ ارشاد ہے: "لا ينظر الله يوم القيامة إلىٰ مَن جرّ إزارهٗ بَطَراً" (قیامت کے دن وہ شخص اللہ کی نظر کرم سے محروم رہے گا جو فخر وغرور میں اپنے ازار کو لٹکائے)۔

۴-اسی طرح لباس اس قدر باریک و مہین بھی نہ ہو کہ اندر کے اعضاء نظر آئیں؛ یہ بے لباسی کی طرح ہے۔ اسی طرح اتنا چست بھی نہ ہو کہ پوشیدہ رکھنے کے لائق اعضاء کی ساخت نمایاں ہونے لگے؛ ایک دفعہ حضرت اسماءؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، ان کا لباس نسبۃً باریک و مہین تھا، آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا، اور ان کو نصیحت فرمائی کہ اس طرح کا لباس مناسب نہیں ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: "رُبَّ كاسيةٍ في الدنيا عارية في الآخرة" (دنیا میں کچھ لباس پہننے والیاں ایسی ہوں گی جو آخرت میں بے لباس ہوں گی)، اس حدیث کی ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو لباس پہن کر بھی بے لباس معلوم ہوتی ہیں، ایسی عورتیں آخرت میں سزا کی مستحق ہوتی ہیں۔ یہ عام عقل میں آنے والی بات ہے کہ اللہ نے لباس کو بدن ڈھانپنے کا ذریعہ بنایا ہے، اسی کو اگر کوئی بدن نمایاں کرنے کا ذریعہ بناتا ہے تو یہ اللہ کے حکم کے ساتھ مکاری ہے، جو اللہ کو گوارا نہیں۔

۵-اسلام کا ایک حکم یہ بھی ہے کہ مرد وعورت کے لباس میں تفریق کا خیال رکھا جائے؛ ایک صنف دوسری صنف کا لباس نہ پہنے؛ یہ مضحکہ خیز بات ہے۔ اسلام لباس کے ذریعے سنجیدگی اور وقار کو فروغ دیتا ہے۔ لباس اس کے نزدیک تماشہ نہیں ہے کہ آدمی ایک لطیفہ بن جائے، مرد و عورت ایک دوسرے کا لباس پہنیں؛ اسلام اسے انحراف فطرت کی ایک شکل قرار دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایسوں پر لعنت فرمائی ہے؛ اس لیے کہ اس طرح کے لوگ صاف ستھرے معاشرے کو پورا ڈرامہ بنا دیتے ہیں، مردوں کی مردانگی اس سے متاثر ہوتی ہے، اور عورت کی نسوانی لطافت مردانہ لباس کی وجہ سے کرختگی میں بدل جاتی ہے، ظاہر باطن پر اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

۶-ایسا لباس پہننا جس سے آدمی چلتا پھرتا اشتہار معلوم ہو شریعت میں ممنوع ہے؛ یہ درحقیقت سستی شہرت پانے کا ایک مضحکہ خیز طریقہ ہے۔ لباس سنجیدگی اور وقار چاہتا ہے، اسے ایسے پر فریب طریقوں کی بھینٹ چڑھایا نہیں جاسکتا۔ کسی جگہ کوئی عام شریفانہ لباس پہنا جاتا ہو وہاں کوئی ایسا لباس پہننا جس سے وہ سب سے الگ تھلگ محسوس ہو ایسے لباس کو "لباس الشهرة" کہا جاتا ہے، نبی اکرم ﷺ نے اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، اس طرز عمل سے ایک خاص قسم کی مکاری جھلکتی ہے اور آدمی پورا بناوٹی معلوم ہوتا ہے، کبھی یہی طرز عمل انسان کو لباس کی راہ سے فخر وغرور میں مبتلا کرتا ہے، بسا اوقات اسی سے نمائشی فقر وزہد میں مبتلا رہنے کا اندیشہ رہتا ہے؛ ارشاد رسالت ہے: "من لبس ثوب شهرةٍ في الدنيا ألبسه الله ثوب مذلّةٍ يوم القيامة" (جو دنیا میں شہرت کا لباس پہنے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے ذلت کا لباس پہنائے گا)۔

۷-کسی قوم کا مذہبی لباس پہننا؛ یہ شاید لباس کی سب سے خطرناک قسم ہے، اس میں دین وایمان کے رخصت ہونے کا خطرہ ہے، اس کو حدیث پاک میں "تشبّہ بالقوم" کہا گیا ہے، اور اس کی وعید ہے کہ ایسا شخص انھیں میں شمار ہوگا؛ "من تشبّه بقومٍ فهو منهم" (جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے)۔ اہل اسلام کے نزدیک دین اسلام سب کچھ ہے، یہ نہ ہو تو پھر اس شخص کا وجود ہی فضول ہے! لہٰذا جس کام کی زد دین پر پڑتی ہو اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا دین کا اصل مطالبہ ہے۔

یہ لباس سے متعلق اسلام کی صاف و شفاف تعلیمات ہیں، جن کو اگر صحیح طریقہ اور اچھے جذبہ سے اپنایا جائے تو یقینی بات ہے کہ ایک صاف ستھرا معاشرہ وجود میں آئے گا، اور موجودہ غیر اسلامی تہذیب نے جو بے ہنگم لباس دنیا کو دیا ہے، بلکہ یوں کہیں کہ لباس کے نام پر جس طرح بے لباسی کی لہر چل پڑی ہے، اس کا خاتمہ بھی ان ہی پاکیزہ تعلیمات سے ہوسکتا ہے: {ولباس التقویٰ ذٰلك خير} (تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے)۔

❁ ❁ ❁

محاسنِ اسلام

اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق

ڈاکٹر سراج الدین ندوی (چیئرمین ملت اکیڈمی، بجنور)

اسلام نے آس پاس رہنے والے انسانوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کی بہت تاکید کی ہے۔ جب پڑوسیوں کے درمیان خوشگوار تعلقات ہوں تو وہ دکھ درد میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور اگر تعلقات خراب ہوں تو انسان مصیبت کے وقت خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس لیے اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ہمدردی، محبت، خیرخواہی اور خدمت کا معاملہ کرے تاکہ محلہ اور سماج کا ماحول پرسکون اور اطمینان بخش رہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سماج میں لوگ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اگر یہ تعاون ختم ہوجائے تو معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی بہت تاکید فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کریں یا جسے اللہ اور رسول کی محبت کا دعویٰ ہو، اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے۔“ [مشکوٰۃ المصابیح]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کے نزدیک سب سے بہتر انسان وہ ہے جو اپنے ساتھی اور پڑوسی کے لیے سب سے بہتر ہو۔“ [سنن ترمذی] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی بڑی تاکید کرتے تھے۔ خود بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے اور صحابہؓ کو بھی ابھارتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت جبرئیلؑ بھی مسلسل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جبرئیل پڑوسی کے بارے میں اتنی تاکید کرتے رہے کہ مجھے خیال ہوا کہیں اسے وراثت میں بھی شریک نہ کردیا جائے۔“ [صحیح بخاری و صحیح مسلم]

پڑوسی چاہے رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار یا کچھ دیر کے لیے آپ کے ساتھ رہا ہو ہر ایک آپ کے حسنِ سلوک کا مستحق ہے۔ اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھئے۔ اس کے غم کو اپنا غم سمجھئے۔ اس کے دکھ درد میں کام آیئے۔ اس کی مصیبتوں کو دور کرنے کی کوشش کیجئے۔ اگر وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوجائے تو اس کی خلاصی کے لیے کوشش کیجئے۔ اس کی خوشی پر فرحت ومسرت کا اظہار کیجئے۔ اس کے بگڑے کاموں کو بنانے میں اس کی مدد کیجئے۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا: **والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب** [النساء: ۳۶] (اور قریب کے پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور پہلو میں رہنے والے ہم نشین کے ساتھ بھی احسان کرو۔)

پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے ہوسکتا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے جو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے وہ دو پڑوسی ہوں گے۔ [مسند احمد]

دوسری حدیث میں پڑوسی کی گواہی کو ہی انسان کے اچھے یا برے ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ”جب تم اپنے پڑوسی کی زبان سے اپنے بارے میں اچھا سنو تو سمجھ لو کہ تم اچھا کررہے ہو، اور جب اپنے پڑوسی کو اپنے بارے میں برا کہتے سنو تو سمجھ لو کہ تم برا کررہے ہو۔“ [سنن ابن ماجہ]

اگر آدمی پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک نہیں کرسکتا تو خدا کے نزدیک اس کا ایمان کامل اور قابلِ اعتبار نہیں۔ ایمان کے قابل اور معتبر ہونے کے لیے پڑوسی کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **”وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ قِیْلَ مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الَّذِیْ لَا یَأْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ“** [متفق علیہ] (خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں، پوچھا گیا کون یا رسول اللہ؟ آپؐ نے فرمایا: ”جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ رہے۔)

اپنے پڑوسی کی ضرورتوں کو اپنی ضرورتوں پر ترجیح دیجئے۔ جو چیز اپنے لیے پسند کرتے ہیں اس کے لیے بھی پسند کیجئے۔ جس طرح اپنے لیے دولت، عزت ووقار کی تمنا کرتے ہیں اس کے لیے بھی تمنا کیجئے کیونکہ اسلام نے پڑوسی کے ساتھ ایسے ہی سلوک کی تاکید کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے پڑوسی کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔“ [صحیح مسلم] اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”وہ شخص مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔“ [مشکوٰۃ المصابیح]

جس طرح آپ کے پڑوس میں رہنے والا آپ کا پڑوسی ہے اسی طرح اگر آپ تاجر ہیں تو آپ کے ساتھ تجارت کرنے والا، آپ اگر ملازم ہیں تو آپ کے ساتھ ملازمت کرنے والا، آپ اگر پڑھتے ہیں

تو آپ کے ساتھ پڑھنے والا، یہاں تک کہ آپ کے ساتھ سفر کرنے والا بھی آپ کا پڑوسی ہے۔ ان تمام پڑوسیوں کے حقوق ادا کیجئے۔

پڑوسیوں کو تحفے تحائف بھیجتے رہئے ،اس سے محبت بڑھتی ہے اور تعلق میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تَهَادُوْا تَحَابُّوْا" [موطا امام مالک] (اورتم آپس میں تحفہ دیا کرو اس سے باہم محبت بڑھتی ہے)۔

گھر میں تیار کی گئیں چیزیں تحفہ میں بھیجئے۔ شادی، عقیقہ وغیرہ کی تقریبات میں شرکت کیجئے۔ ہو سکے تو کچھ تحفے تحائف پیش کیجئے۔ کسی تحفہ کو حقیر یا معمولی نہ سمجھئے۔ اگر پڑوسی بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت وتیمارداری کیجئے۔ اگر خدانخواستہ کوئی پریشانی والی بات پیش آجائے تو تعزیت ودلجوئی کیجئے۔ اگر فقروفاقہ میں مبتلا ہو تو اس کی ضروریات پوری کیجئے۔ حضرت ابوذرؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب شوربا پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کر لو اور پڑوسیوں کا خیال رکھو" [صحیح مسلم] تحفے میں معمولی چیز کو بھی حقیر نہ سمجھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسلمانوں کی عورتوں میں سے کوئی عورت اپنی پڑوسن کے تحفے کو حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کا کھر ہی کیوں نہ ہو" [صحیح بخاری]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے گھر ایک بکری ذبح ہوئی تو انہوں نے پوچھا پڑوسی کو گوشت پہنچا دیا؟ گھر والوں نے کہا پڑوسی تو یہودی ہے۔ انہوں نے فرمایا: "پہلے اسی کے گھر بھیجو۔" نبی اکرمؐ کی ہدایت ہے کہ پڑوسیوں میں ترجیح بھی رکھی جائے۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: "میرے دو پڑوسی ہیں کچھ بھیجنا چاہوں تو کس کے پاس بھیجوں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کا دروازہ تمہارے دروازے کے زیادہ قریب ہو"۔ [ترمذی]

اچھا پڑوسی اللہ کی بڑی نعمت ہے، اگر اللہ آپ کو اچھا پڑوسی دے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کیجئے۔ اگر آپ کو کہیں منتقل ہونا ہو یا کہیں گھر بنانا ہو تو پڑوسی کا جائزہ ضرور لیجئے اور اچھے پڑوس کا انتخاب کیجئے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے: "الجار قبل الدار" (گھر سے پہلے پڑوسی کو دیکھ لو)۔

اگر خدانخواستہ آپ کا پڑوسی اچھا نہیں ہے یا اس کا رویہ آپ کے ساتھ تکلیف دہ ہے تو آپ اس کی اصلاح کی کوشش کیجئے۔ جواب میں اس کے ساتھ برا رویہ نہ اپنایئے۔

آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يُؤْذِ جَارَهٗ [متفق علیہ] (جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔)

برُے پڑوس کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیے۔ اس کی برائی کے جواب میں اس کے ساتھ برائی کا برتاؤ نہ کیجئے؛ بلکہ اچھے برتاؤ سے اس کو متاثر کرنے کی کوشش کیجئے۔ یقین رکھئے کہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح ضرور ہو جائے گی۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرے گا اور وہ آپ کے ساتھ اچھے تعلقات بنائے گا۔ اس کا برا رویہ اچھے رویہ میں بدل جائے گا۔

قرآن میں ارشاد فرمایا گیا: اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ (نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تم برائی کا جواب بہتر طریقے سے دو تو تم دیکھو گے کہ جس شخص کو تم سے دشمنی ہے وہ جگری دوست بن گیا ہے۔)

اس سلسلہ میں حدیث کا ایک واقعہ ہماری اچھی رہنمائی کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار ایک صحابیؓ نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے ایذا پہنچاتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "جاؤ صبر کرو۔" وہ پھر آئے اور اپنے پڑوسی کی شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا: "تم گھر سے اپنا سامان نکال کر منتقل ہونے کی فضا بناؤ۔" انہوں نے جا کر منتقل ہونے کے لیے گھر کا اثاثہ باہر راستہ میں ڈالنا شروع کیا۔ آنے جانے والوں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے صورتِ حال بتائی۔ لوگوں نے پڑوسی کو برا بھلا کہا اور سمجھایا۔ پڑوسی کو اپنے کیے پر ندامت ہوئی وہ ان کو راضی کر کے گھر لایا اور وعدہ کیا کہ آئندہ ایذا نہ پہنچائے گا۔

ایک بار پیارے نبیؐ کے سامنے تذکرہ کیا گیا کہ دو عورتیں ہیں، ان میں سے ایک راتوں کو نمازیں پڑھتی، دنوں کو روزے رکھتی اور خوب صدقہ وخیرات کرتی ہے مگر اپنی زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "اس میں کوئی نیکی نہیں۔ اس کو دوزخ کی سزا ملے گی۔" دوسری عورت کے بارے میں صحابہؓ نے عرض کیا: "وہ صرف فرض نماز پڑھتی، فرض روزے رکھتی اور معمولی صدقہ کرتی ہے مگر اپنے پڑوسیوں کو خوش رکھتی ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "وہ جنتی ہے۔"

مختصر یہ کہ بلا تفریق مذہب وملت تمام پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے، ان کی ہر ضرورت پوری کرنے کی کوشش کیجئے۔ ان کے ہر دکھ درد میں کام آیئے، ان کی خوشی کے موقع پر اپنی خوشی کا بھی اظہار کیجئے، انہیں حسب موقع گھر بلایئے اور ان کے گھر پر بھی جایئے، ان کی خوشی اور غم کی تقریبات میں شرکت کیجئے اور اپنے یہاں بھی خوشی کی تقریبات میں شرکت کی دعوت دیجئے، ان سے اپنے تعلقات محض رسمی نا بنائیں بلکہ مخلصانہ اور جذباتی بنانے کی کوشش کیجئے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ اسلام میں پڑوسی کا تصور بہت وسیع ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "چالیس گھروں تک پڑوس رہتا ہے۔" امام زہریؒ کہتے ہیں کہ پڑوس میں دائیں بائیں اور آگے پیچھے کے چالیس چالیس گھر شامل ہیں۔

فکرونظر

تحریفِ قرآن اور مصنوعی ذہانت

ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی (آئرلینڈ)

مصنوعی ذہانت کے استعمال کے بے تحاشہ فوائد گنوائے جاتے ہیں مگر مصنوعی ذہانت بالخصوص جنریٹیو مصنوعی ذہانت کے دینی علوم میں استعمال سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ چونکہ دلائل شرعیہ میں سب سے اولین قرآنِ پاک ہے لہذا قارئین کی خدمت میں ہم تین مثالیں پیش کرتے ہیں کہ کس طریقے سے مصنوعی ذہانت کو قرآنی علوم میں استعمال کیا جارہا ہے اور اس کے کیا نقصانات ہو رہے ہیں۔

مثال اول: قرآنِ پاک کی نعوذ باللہ من گھڑت آیت بنانا

مصنوعی ذہانت کے ذریعے قرآنِ پاک کی نعوذ باللہ من گھڑت آیات بنائی گئی ہیں۔ ابھی حال ہی میں مسلم کونسل آف برطانیہ (ایم سی بی) ایک خطبہ جاری کیا جس میں قرآنِ پاک کی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا جو کہ قرآنِ پاک میں موجود ہی نہیں ہے، وہ من گھڑت قرآنی آیت یہ تھی (نقل کفر کفر نباشد):

قرآنی آیت: وظن المومنون والمومنت باللہ ظنا حسناً (احزاب: ۱۰) ترجمہ: اور مومن مرد اور مومن عورتیں، دونوں خدا کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔

جب ٹوئیٹر پر ایک صاحب نے اس من گھڑت قرآنی آیت کی غلطی کی نشاندہی کی تو پھر مسلم کونسل آف برطانیہ نے تین اپریل ۲۰۲۵ کو اپنے ٹوئیٹر اکاؤنٹ سے باقاعدہ اس پر معذرت کی، تحقیقات کرنے کا عندیہ دیا کہ یہ کیسے ہوگیا، آئندہ ایسی غلطی نہ ہونے کی یقین دہانی کروائی اور اپنی ویب سائٹ سے وہ خطبہ بھی ہٹا دیا۔ اس سے چار باتیں بالکل واضح ہوگئیں:

اول یہ کہ مسلم کونسل آف برطانیہ نے مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر کو استعمال کر کے خطبہ تیار کیا۔

دوم یہ کہ اس خطبے کی تیاری کے بعد اس کو پڑھا تک نہیں گیا تاکہ اس سنگین غلطی کی نشاندہی ہوسکے۔

سوم یہ کہ مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر من گھڑت قرآنِ پاک کی آیات تک بنا دیتے ہیں سورۃ نمبر اور آیت نمبر کے حوالے کے ساتھ، اور

چہارم یہ کہ یہ من گھڑت قرآنی آیت مسلمانوں کے ہی ایک پلیٹ فارم سے جاری کی گئی۔

ایک عام انسان جب مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر مثلاً چیٹ جی پی ٹی سے سطحی طور پر مکالمہ کرے گا اور کہے گا کہ نعوذ باللہ قرآن جیسی کوئی آیت بنا کر دکھاؤ تو چیٹ جی پی ٹی کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ ”قرآن پاک اللہ کا کلام ہے، اور اس جیسا کلام بنانا نہ صرف انسانی طور پر ناممکن ہے بلکہ اسلام میں اس کی کوشش کرنا بھی سخت منع ہے“۔ اب اس جواب سے عام انسان متاثر ہوجائے گا اور یہی سمجھے گا کہ چیٹ جی پی ٹی قرآنی آیت نہیں گھڑتا اور کمپیوٹر سائنسدان اور محققین شاید جھوٹ بول رہے ہیں۔ درحقیقت سائنسدان و محققین جھوٹ نہیں بول رہے، اس کی چند وجوہات ہیں:

اول، اوپر ہم نے شواہد پیش کر دیے کہ ایسی آیت بنائی جاچکی ہے۔

دوم: جو بھی ان مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر کی ساخت اور کام کا طریقہ کار جانتا ہے اور اس نے گہرائی کے ساتھ ان کو استعمال کیا ہے تو وہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ یہ مواد گھڑتا ہے اور یہ کسی وقت بھی نئی قرآنی آیت نعوذ باللہ گھڑ سکتا ہے۔

لہذا کسی موضوع پر جب کوئی مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر سے خلاصہ بنائے گا یا کوئی مکالمہ کر رہا ہوگا تو وہ سافٹ ویئر کبھی بھی کسی قرآنی آیت کا حوالہ دے سکتا ہے جو کہ حقیقتاً قرآنِ پاک کی آیت نہ ہو۔

سوم، پرامپٹ انجینئرنگ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر ان مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر سے تعامل کیا جائے گا تو ان سافٹ ویئرز کی خوبی اور خامی دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً اگر ہم ان سافٹ ویئر سے کچھ سوال کریں اور سیاق وسباق پیش نہ کریں تو ہوسکتا ہے کہ ان کا جواب مکمل درست نہ ہو۔ مگر اگر ہم ایک خاص طرز پر پرامپٹس بنائیں جو کہ درست ہوں، مکمل ہوں اور ایسے ہوں جن پر مصنوعی ذہانت کا ماڈل کام کرسکے تو یقیناً ایسی قرآنی آیات بنائی جاسکتی ہیں، معاذ اللہ۔

مثال دوم: قرآنِ پاک کی مصنوعی ذہانت سے تفسیر و ترجمہ کرنا

برطانیہ کے ایک صاحبِ علم مصنوعی ذہانت سے قرآنِ پاک کے ممکنہ ترجمہ وتفسیر کے استعمال پر بات کرتے نظر آتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے لیکچرز بعنوان آرٹیفیشل مفسر یعنی مصنوعی مفسر اور دیگر تفسیر کے عنوان پر مقالہ جات بھی موجود ہیں (حوالہ: ابن عاشور سینٹر، برطانیہ)۔ اپنے

ایک لیکچر میں وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ مصنوعی ذہانت کے سافٹ وئیر مثلاً چیٹ جی پی ٹی سے سوال کرتے ہیں کہ قرآن پاک کی کی فلاں آیت کا ترجمہ کیا ہوگا؟ پھر جب چیٹ جی پی ٹی جواب دیتا ہے تو پھر وہ اس سے مزید سوال کرتے ہیں کہ اس آیت کے فلاں معنی بھی تو ہوسکتے ہیں؟ بعض سوالات کے جوابات پر چیٹ جی پی ٹی معذرت کرتا ہے، اور بعض مرتبہ "ہیلوسینیشن" Hallucination کرتا ہے۔ ہیلوسینیشن کے معنی فریبِ نظر، واہمہ، ہذیان، جھوٹا گمان یا تصور ہونے کے ہیں۔ آسان الفاظ میں "اگر آپ کو کسی شے یا انسان کی غیر موجودگی میں وہ شے یا انسان نظر آنے لگے یا تنہائی میں جب آس پاس کوئی نہ ہو آوازیں سنائی دینے لگیں تو اس عمل کو ہیلوسینیشن کہتے ہیں"۔

(حوالہ: پروفیسر رابن ایمسلے، مقالہ نمبر ۵۲، سیز وفیرنیا، ۲۰۲۴)

مصنوعی ذہانت میں ہیلوسینیشن سے مراد یہ ہے کہ مصنوعی ذہانت کے سافٹ وئیر بالکل جھوٹی بات بیان کررہے ہوں مگر اس طریقہ اور اتنے یقین سے پیش کریں کہ سچ لگے۔

(حوالہ: ہیلوسینیشن کیا ہے؟ یونیورسٹی آف ایری زونا، امریکہ)

الغرض ان صاحبِ علم کی "سائنسی تحقیق" سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مصنوعی ذہانت کے سافٹ وئیر شاید مافوق الفطرت صلاحیتوں کے مالک ہیں، ان سافٹ وئیر میں عقل اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے، ان سافٹ وئیر کے سامنے آج تک لکھی گئی مختلف تفاسیر موجود ہیں اور اُن تفاسیر میں سے وہ خلاصہ کرکے صحیح تجزیہ ونتائج نکال سکتے ہیں لہٰذا ایسے مصنوعی ذہانت کے سافٹ وئیر سے مکالمہ کرکے قرآنِ کریم کے ممکنہ ترجمہ پر غور وخوض کیا جاسکتا ہے۔ الغرض مصنوعی ذہانت کے الگورِتھمز استعمال کرکے وہ قرآنِ پاک کے ممکنہ ترجمہ وتفسیر پر کام کررہے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے سورۃ یوسف کا ترجمہ کیا ہے جس سے ایک مثال سورۃ یوسف، آیت نمبر چھیانوے، ہم یہاں پر ذکر کرتے ہیں۔

ان صاحبِ علم کے سورۃ یوسف کی آیت نمبر چھیانوے کے انگریزی ترجمہ وحاشیہ کو پڑھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ صاحبِ علم کئی وجوہات کی بنا پر اس امکان کو ترجیح دیتے ہیں کہ "البشیر" کوئی شخص نہیں بلکہ قمیص ہے۔ نیز اپنے ایک لیکچر میں وہ Chat GPT and my Bashirt Theory چیٹ جی پی ٹی اور میری خوشخبری دینے والی قمیص کی تھیوری" پیش کرتے ہیں جس میں وہ تجویز کرتے ہیں کہ "البشیر" خوشخبری دینے والا" کوئی شخص نہیں ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹا بلکہ اصل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص ہے جو کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو رکھتی ہے اور ثبوت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندہ ہیں۔

اپنے اس لیکچر میں سورۃ یوسف کی آیت نمبر 96 میں "البشیر" کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ کیا ہوگا اگر ہم یہ سوچیں کہ "البشیر" کوئی شخص نہ ہو؟ کیا مصنوعی ذہانت "البشیر" سے متعلق ہمیں کچھ ممکنات بتاسکتی ہے جن کے متعلق ہم سوچ سکیں اور اسے اختیار کرسکیں؟ کیا مصنوعی ذہانت کے سافٹ وئیر ہماری سوچ وفکر کی اڑان سے پہلے سوچ سکتا تھا اور ہمیں یہ تجویز دے سکتا تھا کہ "البشیر" کوئی شخص نہیں بلکہ قمیص ہے؟ الغرض ان صاحب علم کے مطابق "البشیر" کوئی شخص نہیں بلکہ قمیص ہے اور اسی ترجمہ کو انہوں نے اپنے سورۃ یوسف کے ترجمہ میں اختیار کیا ہے۔

یہ صاحبِ علم "أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ" کے تحت مفسرین جیسے امام رازیؒ اور امام آلوسیؒ کی تفاسیر کا حوالہ دے کر کہتے ہیں کہ اس آیت کو ان مفسرین کے مطابق متبادل بھی پڑھا جاسکتا ہے جیسے کہ "خوشخبری دینے والے نے قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دی یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے قمیص اپنے چہرے پر خود ڈال دی"۔ ان صاحبِ علم کے بقول اس آیت کو متبادل پڑھنے کی بیج (بنیاد) ان مفسرین نے ڈالی اور اُن کے لیے تو صرف ایک قدم اور تھا کہ وہ سوچیں کہ "البشیر" ہرگز کوئی شخص نہیں ہے بلکہ اصل میں قمیص ہی کی تفصیل ہے۔

(حوالہ: دی ان ٹرانسلیٹڈ قرآن، ابن عاشور سینٹر، برطانیہ)

بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ ان صاحب علم کو یہ فکر بھی لاحق تھی کہ کہیں اُن پر اہلِ علم اور مفسرین حضرات کی جانب سے علمی گرفت نہ کی جائے، لہٰذا اپنی تجویز پیش کرنے کے بعد حاشیہ میں ایک جگہ یہ بھی تحریر کردیا ہے کہ "چونکہ انہوں نے بالکل واضح نہیں کیا وہ یہی ہے کہ کیا "البشیر" شخص ہے یا قمیص"۔

"البشیر" کو بطور قمیص سمجھنے کے بالمقابل جب ہم مفسرین کے تراجم وتفاسیر دیکھتے ہیں تو وہ "البشیر" کو بطور شخص لیتے ہیں، مثلاً سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۹۶ کا ترجمہ آسان ترجمہ قرآن از حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم اس طرح کرتے ہیں:

"پھر جب خوشخبری دینے والا پہنچ گیا تو اُس نے (یوسف کی) قمیص ان کے منہ پر ڈال دی، چنانچہ فوراً ان کی بینائی واپس آگئی"۔

اس آیت کی تشریح میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دام ظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ:"خوشخبری دینے والے" حضرت یوسف علیہ السلام کے سب سے بڑے بھائی تھے جن کا نام بعض روایات میں یہوداہ اور بعض میں روبن آیا ہے۔ اور خوشخبری دینے سے مراد یہ خوشخبری ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ابھی زندہ ہیں، اور انہوں نے سب گھر والوں کو اپنے پاس بلایا ہے۔ یہ بھی ایک معجزہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص چہرے پر ڈالنے سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آگئی۔ مفسرین نے فرمایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص سے کئی اہم واقعات ظاہر ہوئے۔ انہی کی قمیص کو ان کے بھائی خون لگا کر لائے تھے، اور اس کو صحیح سالم دیکھ کر حضرت یعقوب علیہ السلام یہ سمجھ گئے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھیڑیے نے نہیں کھایا، اور انہی کی قمیص تھی جو زلیخا نے پیچھے سے پھاڑی، اور اس سے ان کی بے گناہی ثابت ہوئی، اور اب یہی قمیص تھی جس کی خوشبو حضرت یعقوب علیہ السلام کو دُور سے محسوس ہوئی، اور بالآخر اس سے ان کی بینائی واپس آئی۔" (آسان ترجمہ قرآن، صفحہ ۴۸۹)

"البشیر" کو بطور شخص سمجھنے کا ترجمہ و تفسیر شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی اختیار فرمایا ہے جس کو آسان بیان القرآن مع تفسیر عثمانی، جلد دوم، تسہیل و ترتیب حضرت مولانا عمر انور بدخشانی، صفحہ ۲۰۰ میں قارئین ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

ہماری ان تمام تفصیلات فراہم کرنے پر کسی کے ذہن میں یہ خیال آسکتا ہے کہ "البشیر" کا ترجمہ بطور شخص کیا جائے یا بطور قمیص، اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا اور اس طرح کے تراجم کے اختلافات سے سے تفاسیر بھری پڑی ہیں اور مفسرین حضرات قرآنی آیات کے ترجمہ و تفسیر میں اختلاف کرتے رہے ہیں۔

قارئین یاد رکھیں کہ یہ کوئی معمولی فرق نہیں ہے، بعض اوقات فرق معمولی ہوتا ہے یا دیکھنے میں چھوٹا دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کے عواقب و نتائج بہت دور تک پہنچتے ہیں۔ لہٰذا مصنوعی ذہانت کو قرآنِ پاک کے ترجمہ و تفسیر کے لیے اختیار کرنے کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے اور اس کی کئی وجوہات ہیں:

اول یہ کہ اگر بعض مفسرین نے "یعقوب علیہ السلام نے قمیص اپنے چہرے پر خود ڈال دی" اپنی تفسیر میں تحریر بھی فرمایا تو اس سے "البشیر" کا قمیص ہونا کیسے ثابت ہوتا ہے؟

دوم یہ کہ یہ مفسرین حضرات تھے جنہوں نے قرآنِ پاک کی آیات کی تفسیر پیش کی ہے جبکہ یہاں پر مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر قرآنِ پاک کا ترجمہ و تفسیر کررہے ہیں جو کہ اپنی اصل میں مشین ہے جو کہ انسان کا متبادل ہرگز نہیں ہوسکتی۔

سوم یہ کہ ان مصنوعی ذہانت کی مشینوں میں ذہانت قطعاً نہیں بلکہ یہ تو جھوٹا مواد گھڑتی ہیں اور ان گنت سائنسی تحقیقات میں ان کے نقائص کو کمپیوٹر سائنسدانوں نے واضح بیان کیا ہے۔

چہارم یہ کہ مصنوعی ذہانت سے مستقبل میں قرآنِ پاک کا مفہوم بالکل ہی تبدیل کیا جاسکتا ہے (جس کی ایک مثال ہم "مثال اول" میں پیش کرچکے ہیں کہ کس طرح قرآنی آیت گھڑی گئی)۔

مثال سوم: مصنوعی ذہانت سے قرآن کے چھپے پہلوؤں کو سمجھنا

غلام احمد پرویز کے ادارہ طلوعِ اسلام لاہور کے آفیشل سوشل میڈیا پلیٹ فارم سے ۱۲ نومبر ۲۰۲۴ کو نشر ہونے والی ایک تقریر بعنوان "قرآنِ کریم اور آرٹیفیشل انٹیلیجنس" میں کچھ یوں کہا گیا ہے:

" آرٹیفیشیل انٹیلیجنس (مصنوعی ذہانت) ہمیں قرآن کے ایسے پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے جو عام طور پر دیکھنا مشکل ہوتے ہیں جیسے بار بار آنے والے موضوعات اور سورتوں میں موجود مشترکہ کہانیاں۔ اے آئی سے ہر زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے جس سے دنیا کے مسلمان اور غیر مسلمان قرآن کو اپنی زبان میں سمجھ سکتے ہیں"۔

ان تین مثالوں سے قارئین کو یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہوگی کہ مصنوعی ذہانت کو علومِ قرآنی بالخصوص قرآنِ پاک کے ترجمہ و تفسیر اور اس کے چھپے ہوئے پہلوں کو سمجھنے کے لیے بڑے پیمانے پر عالمی سطح پر کوششیں جاری ہیں۔ الغرض، راقم نے یہ تفصیلات بطور خاص حضرات مفتیانِ کرام، مفسرین اور اہلِ علم حضرات کی خدمت میں پیش کی ہیں تاکہ وہ ایسی تمام کوششوں کا علمی جائزہ لے سکیں کہ مستقبل میں مصنوعی ذہانت سے قرآنِ پاک کے ترجمہ و تفسیر کرنے سے امتِ مسلمہ کو کیا ممکنہ خطرات پیش آسکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مصنوعی ذہانت کے سافٹ ویئر من گھڑت قرآنِ پاک کی آیات تک بنادیتے ہیں اور وہ بھی سورۃ نمبر اور آیت نمبر کے حوالے کے ساتھ اور وہ آیت قرآنِ پاک میں موجود ہی نہیں ہوتی۔ یہی کچھ حال احادیث مبارکہ اور دیگر علمی مواد کے ساتھ بھی ہورہا ہے۔ لہٰذا مدارسِ دینیہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ طلباء کرام مصنوعی ذہانت کو دینی علوم میں سرے سے استعمال ہی نہ کریں۔

احسان وتزکیہ

عہدِ حاضر میں تصوف کی معنویت

شاہ اجمل فاروق ندوی (دہلی)

تصوف کے متعلق یہ بحث اب فضول ہو چکی ہے کہ کون سا تصوف اسلامی ہے؟ اور کون سا غیر اسلامی؟ اس موضوع پر اتنا لکھا جا چکا اور اس مسئلے کی وضاحت اس کثرت کے ساتھ کی جا چکی کہ اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ گئی۔ سچی بات یہ ہے کہ تصوف کے نام پر جو خرافات، غیر اسلامی اعمال اور لغو چیزیں مفاد پرست اور دولت پرست لوگوں نے ایجاد کر لی ہیں، اُنھیں تصوف کہنا ہی غلط ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں پھیلی بدکاریوں کی بنیاد پر اسلام کو بدنام نہیں کیا جا سکتا، اُسی طرح جاہل اور دولت پرست ٹولے کی حرکتوں کی وجہ سے تصوف کو بُرا نہیں کہا جا سکتا۔

امام قشیری اور علامہ محاسبی سے لے کر برصغیر میں عہد جدید کے علماء مولانا اشرف علی تھانوی یا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تک تمام علماء و صالحین اس بات کی وضاحت کرتے آئے ہیں کہ تصوف کا مقصد رضائے الٰہی ہے اور اس کے حصول کا راستہ شریعت اسلامی ہے۔ شریعت اسلامی سے ہٹ کر جو راہ بھی اختیار کی جائے گی، وہ ناقابل قبول اور باعثِ عذاب ہوگی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب ''تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک'' میں بہت صاف لفظوں میں بیان کیا ہے کہ قرآن کریم کی اصطلاح ''تزکیہ'' اور حدیث نبوی کی اصطلاح ''احسان'' ہی کو تصوف کا نام دیا گیا۔ کسی کو اس نام پر کوئی اعتراض ہو تو اِن دونوں ناموں میں سے کوئی ایک یا دونوں اختیار کر لے۔ لیکن اس کی ضرورت یا عدم ضرورت پر کوئی بحث نہیں کی جا سکتی۔ کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی روح پاک ہو چکی، اس کا دل صاف شفاف ہو چکا، اُسے رضائے الٰہی کی نعمت مل چکی اور اب کبھی یہ چیزیں اُس سے دور نہیں ہو سکتیں۔ جب یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تو اِن چیزوں کے حصول کے لیے کی جانی والی کوشش کی اہمیت کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے؟

عہد حاضر میں ہونے والی ترقیات کا اندازہ ہر ہوش مند کو ہے۔ انسانی زندگی کا ظاہری ڈھانچہ بہت آسان ہو گیا ہے۔ ایک طرف مشینی زندگی ہے اور دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام۔ یعنی ایسی مشینی زندگی، جس کا محور و مدار (Center) مادہ ہے۔ مشینی زندگی اور سرمایہ دارانہ نظام کے ملاپ سے انسانی زندگی کا جو سانچہ تیار ہوا ہے، وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ دن رات مشینوں کے ساتھ وابستگی نے انسان کو بھی ایک مشین بنا دیا ہے۔ ایک ایسی مشین، جو کام کرتی رہتی ہے، دولت جمع کرتی رہتی ہے، جمع شدہ دولت کو دوگنا چوگنا کرنے کی ترکیبیں سوچتی رہتی ہے اور اسی اُدھیڑ بن میں ایک دن بند ہو جاتی ہے۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت اُس بند مشین کو نہیں چلا سکتی۔ یہ ہے عہد حاضر کا انسان۔

ظاہر سی بات ہے کہ یہ فطری زندگی نہیں، سراسر غیر فطری (Unnatural) زندگی ہے۔ لہٰذا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آج کا انسان اور پورا معاشرہ بے شمار خطرناک مسائل سے دوچار ہو گیا ہے۔ فرد بھی بیمار ہے اور معاشرہ بھی۔ تنہائی اور اکیلے پن کا احساس، مادی آقاؤں کی غلامی کا احساس، انجانا خوف، دماغی دباؤ، روحانی بے چینی، جسم کو توڑ کر رکھ دینے والی تکان، دوسرے کی مادی ترقی پر جلن، حسد اور اُس سے بغض و عناد، اپنی پسپائی، ناکامی اور شکست کا احساس، دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے ذہن و دماغ اور جسم کو ایسی مشقت میں ڈالنا، جس کے وہ اہل نہیں ہیں، مال جمع کرنے اور پراپرٹی جمع کرنے کے چکر میں بخل کا شکار ہونا، کنجوسی کے نتیجے میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے کم میل جول، مال کو سب کچھ سمجھنے کی وجہ سے غریبوں کو ذلیل اور مال داروں کو معزز سمجھنا، غریبوں کو جھڑکنا اور مال داروں کے سامنے ہر دم ہاتھ جوڑے کھڑے رہنا۔ یہ اور اس طرح کے متعدد مسائل آج کے انسان کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکے ہیں۔ وہ بے چارہ چاہ کر بھی اِن کی گرفت سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف خودکشی کے واقعات، لوٹ کھسوٹ، دھوکہ دہی، قتل، بڑے بڑے فراڈ، رشوت، سود، نفرت، دشمنی، جھوٹ اور آپسی ناچاقی عام ہے تو دوسری طرف ذہنی و دماغی بیماریاں، شکر، قلبی عوارض اور نہ جانے کیسی کیسی بیماریاں پوری انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہیں۔ اس سے

بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ انسان کو اب بھی ان بیماریوں کی جڑ کا ادراک نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو وہ اُس جڑ کو کاٹنے کی ہمت نہیں رکھتا۔

ایسے حالات میں اسلام کے نظامِ تزکیہ و احسان اور نظامِ تصوف وسلوک کے لیے کام کرنے کا وسیع ترین میدان کھلا ہوا ہے۔ آج کے انسان کو پہلے سے کہیں زیادہ تصوف کی ضرورت ہے۔ اگلے زمانوں کا انسان صرف روحانی امراض کے علاج کے لیے تصوف سے وابستہ ہوتا تھا، آج کا انسان روحانی امراض کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی بیمار ہو چکا ہے۔ بیماریاں بھی معمولی نہیں، مہلک اور تباہ کن۔ آج کے انسان کے بے شمار مسائل حل ہو جائیں، اگر وہ خلوص دل کے ساتھ اس نظام کا تجربہ کر کے دیکھے۔ اس کی زندگی سکون و اطمینان سے بھر جائے۔ بے چینی اور اضطراب ختم ہو جائے۔ کیوں کہ دنیا کی بے حیثیتی، اخروی زندگی کی ہمیشگی کا یقین، مادہ (Material) کے بے اصل ہونے، بہ ظاہر معمولی نظر آنے والے اخلاقی امراض کے انتہائی خطرناک ہونے کا یقین، ایک ذات کے مالک وحاکم ہونے اور باقی سب کے غلام وحقیر ہونے کا احساس، دنیا کی سب سے بڑی نعمت رضائے الٰہی کو سمجھنا اور اس کے حصول کو اپنی زندگی کا مدار اور محور بنانا، ایک خاص ترتیب کے ساتھ رشتے داروں، عزیزوں، پڑوسیوں، دوستوں، غریبوں، ناداروں، حتیٰ کہ جانوروں، پرندوں اور نباتات تک کے حقوق کی اہمیت، انسان کو ایک فطری زندگی گزارنے پر آمادہ کرتی ہے۔ شریعت کی روشنی میں ان تمام عقائد واخلاق کی تربیت کا نام ہی تصوف ہے۔ عقائد کی پختگی اور اخلاق کی برتری ہی تصوف کا موضوع ہے۔ اگر انسانیت اس عظیم نظام سے وابستگی اختیار کر کے اپنا سفر آگے بڑھائے گی تو مادی ترقی کے ساتھ روحانی ترقی بھی اس کا مقدر بن جائے گی۔ وہ روحانی ترقی، جس کے بغیر مادی ترقیات انسان کے لیے آفت اور مصیبت بن چکی ہیں۔ بالکل اسی طرح، جس طرح روح کے بغیر جسم بے کار ہوتا ہے، اُسی طرح دنیا کی روحانی ترقی کے بغیر مادی ترقی کا کوئی مطلب نہیں۔

عہد حاضر میں تصوف کی معنویت اور اہمیت و افادیت سمجھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کے انسان کے لیے تصوف کو قابل عمل بنایا جا سکتا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے مسائل حل کر سکے؟ اس کا بہت آسان جواب یہ ہے کہ تصوف اسلام کا ایک انتہائی اہم شعبہ ہے۔ لہٰذا جس طرح اسلام کے اندر ہر دور اور زمانے کا ساتھ دینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے، اُسی طرح تصوف کے اندر بھی یہ صلاحیت بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ عہد حاضر میں تصوف کے حقیقی علم بردار اسے دنیا کے سامنے ایک بہترین عملی حل (Practical solution) کے طور پر پیش کرتے ہیں یا نہیں؟

حق یہ ہے کہ تصوف اور تصوف کے اعمال آج کے انسان کے اکثر مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تلاوت قرآن کی متعینہ مقدار کی تلاوت اور اس کے ترجمے وتفسیر کا مطالعہ، ذکر جلی، ذکر خفی، مراقبہ، ہمیشہ معیت الٰہی کے احساس کی کوشش، اتباعِ سنت کی بھرپور کوشش، مطالعۂ فطرت، انکسار، تواضع، سخاوت، شجاعت، نرم دلی، رحم دلی، خلق خدا سے پیار، دنیا سے بے رغبتی، ضرورت بھر چیزوں کا استعمال، بہت کچھ اعمالِ خیر کرنے کے باوجود کچھ نہ کرنے کا احساس، اپنے حقیر ہونے کا احساس، معرفت الٰہی کے معمولی سے معمولی موقعے کو ضائع نہ جانے دینے کی کوشش، رب سے ملاقات کا شوق، شیخ سے ملاقات کی زیادہ سے زیادہ کوشش، حتی الامکان صالحین کی صحبت اختیار کرنے کی کوشش، شیخ سے اپنے تمام مسائل کھل کر بیان کرنا، شیخ سے اپنی روحانی وقلبی کیفیات بیان کرنا، سیئات سے حتی الامکان بچنے کی کوشش، کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی تلافی اور استغفار، چلتے پھرتے توبہ و استغفار کرتے رہنا، درود وسلام کی کثرت، کثرت سے صدقہ وخیرات کرنا، نفل نمازوں، بالخصوص تہجد کا اہتمام اور الحاح وزاری کے ساتھ توبہ، استغفار اور دعا کا اہتمام کرنا۔ یہ تمام اعمال ہمیشہ سے اہل تصوف کی شناخت ہیں۔ آج بھی معتبر اہل تصوف ان پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ یہی وہ اعمال ہیں، جو آج کے انسان کے مسائل بڑی حد تک حل کر سکتے ہیں۔ ان اعمال کے ذریعے انسان کو ظاہری امراض سے بھی نجات ملتی ہے اور باطنی امراض سے بھی۔ جسمانی بیماریاں بھی ختم ہوتی ہیں اور روحانی بیماریاں بھی۔ ذرا بھی احساس (Sense) رکھنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اعمال انسان کو کس درجہ جسمانی و روحانی سکون عطا کریں گے۔ ان اعمال کو اختیار کر کے اکیسویں صدی کے بے چین انسان کی ساری بے چینی اور بیمار معاشرے کی تمام بیماریاں ختم ہو سکتی ہیں۔

رحمت وبرکت

درود- رحمتوں کا خزینہ

محمد سمعان خلیفہ ندوی (بھٹکل)

امت پر رسول کریم ﷺ کے بے شمار احسانات ہیں جن کی بنا پر امت پر آپ ﷺ کے بہت سے حقوق ہیں، انھیں میں ایک بڑا حق آپ ﷺ کے لیے دعائے رحمت کرنا یعنی درود وسلام بھیجنا ہے۔ یہ آپ ﷺ سے محبت کی بھی علامت ہے اور آپ کے احسانات کے تئیں شکرگزاری کے احساس کو بیدار کرنا بھی، آپ کی خدمات کا اعتراف بھی ہے اور آپ کے حقوق کے تئیں فکرمندی بھی، اور خود اپنی طرف اللہ کی رحمتوں کو متوجہ کرنے کا ذریعہ بھی۔ یہ رحمتوں کا خزینہ ہے اور برکتوں کا گنجینہ۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے اپنی طرف سے ستائش اور تحسین کا خراج بھی اور دلوں کی سختی کا علاج بھی، اس سے دلوں میں ایک خاص قسم کی لطافت اور نرمی پیدا ہوتی ہے اور عبادات کے لیے دل چسپی بھی، گناہوں سے اپنے آپ کو بچانے میں بھی درود کا بڑا کردار ہے اور احساسات کو پاکیزہ بنانے میں بھی۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب **جلاء الأفہام** میں درود شریف کے چالیس سے زائد فضائل لکھے ہیں۔ درود شریف کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہوتی ہے، اس عمل کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اہل ایمان کو اس کا حکم دینے سے قبل خود اپنے لیے بھی یہ لفظ اختیار فرمایا: **إن اللہ وملائکتہ یصلون علی النبي یا أیہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ [الأحزاب:۵۶]**

(بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود اور خوب سلام بھیجا کرو) یعنی اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے دعائے رحمت کرتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی دعائے رحمت یعنی درود وسلام بھیجا کرو۔

اللہ کی طرف سے درود کا مطلب ہے:

رحمت اور عنایت۔ بخشش اور مغفرت۔ درجات کی بلندی۔ ذکرِ جمیل اور نیک نامی۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس آیت کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی شانِ بلند کا اعلان ہے۔ اللہ نے آسمان والوں کو آپ ﷺ پر درود بھیجنے کا حکم دیا اور زمین والوں کو بھی، تاکہ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی مدح وثنا کا پوری کائنات اور عالم موجودات میں چرچا ہو۔

درودوں میں سلاموں میں مؤذن کی اذانوں میں
نبی کا نام تاباں ہے زمینوں آسمانوں میں
کوئی بدبخت کیا جانے نبی کی شانِ رفعت کو؟
خدا اور سب ملائک ہیں نبی کے مدح خوانوں میں

میں ایک درود کے بدلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دس رحمتیں نازل ہوتی ہیں؛ صحیح مسلم میں ہے: ''جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے، اللہ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے''۔

درود پڑھنے پر رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کی خوش خبری سنائی گئی ہے؛ ترمذی کی روایت ہے کہ ''قیامت کے دن میری شفاعت کے سب سے زیادہ حق دار وہ ہوں گے جو مجھ پر کثرت سے درود بھیجتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ''جو میرے لیے اللہ سے وسیلہ مانگے، اس کے لیے میری شفاعت لازم ہو جائے گی۔''

درود کے اجر پر رسول اللہ ﷺ کی خوشی

ایک دن آپ ﷺ خوش خوش تشریف لائے اور فرمانے لگے: ''میرے رب نے کہا ہے: اے محمد! تمھاری امت میں سے جو تم پر درود بھیجے گا، میں اس پر دس درود بھیجوں گا، اور جو سلام بھیجے گا، میں اس پر دس سلام بھیجوں گا۔'' (نسائی)

صحابہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! سلام کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہے، درود کس طرح پڑھیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''**اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد... إلی آخرہ**''۔

درود شریف دعاؤں کی قبولیت کا ذریعہ

ایک موقع پر ایک شخص نے نماز پڑھ کر صرف یہ دعا کی: 'اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ پر رحم کر۔' آپ ﷺ نے اس سے ارشاد فرمایا: 'اے نمازی! تم نے جلدی کی۔ جب بیٹھو تو پہلے اللہ کی حمد کرو، پھر مجھ پر درود بھیجو، پھر اپنی دعا کرو۔'

اس کے بعد ایک دوسرے شخص نے ایسا ہی کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: 'اے نمازی! دعا کرو، قبول کی جائے گی۔' (مسند احمد)

درود شریف سے غم دور اور گناہ معاف ہوتے ہیں

ترمذی کی روایت ہے کہ حضرت اُبی بن کعب

رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: 'یارسول اللہ! میں آپ پر بہت درود بھیجتا ہوں۔ میں اپنی دعا کا کتنا حصہ درود بنا دوں؟' آپ ﷺ نے فرمایا: 'جتنا چاہو، اگر بڑھاؤ تو تمھارے لیے بہتر ہے۔' پھر جب انھوں نے کہا: "یارسول اللہ! میں اپنی ساری دعا آپ پر درود بنانے کو تیار ہوں' تو آپ ﷺ نے فرمایا: 'پھر اللہ تمھارا ہر غم دور کر دے گا اور تمھارا ہر گناہ معاف کر دے گا۔'

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ایک بار درود بھیجتا ہے، اللہ اس پر دس رحمتیں نازل کرتا ہے، اور اللہ کی رحمت سے غم بھی دور ہوتے ہیں اور گناہوں کی مغفرت بھی۔

قبرِ مبارک کے پاس فرشتہ ہمارا درود پہنچاتا ہے

ایک فرشتے کو اللہ تعالی نے آپ ﷺ کی قبر پر مقرر کیا ہے جو ہر درود بھیجنے والے کا نام اور اس کے والد کا نام لے کر عرض کرتا ہے: 'یا محمد! فلاں بن فلاں نے آپ پر درود بھیجا ہے۔' اور اللہ اس شخص پر اس کے ہر درود کے بدلے دس درود بھیجتا ہے۔

سبحان اللہ! کتنی لذت کی بات ہے! سوچیے اس احساس سے ہی عشاق کو کتنی خوشی ہوتی ہوگی کہ محبوب کے دربار میں اس کے نام سے محبت کی سوغات پہنچائی جا رہی ہے!

اگرچہ ہدیۂ ناچیز کم عیار سہی
ہزار دامنِ ایمان تار تار سہی
تمھارا نام ہے تسکینِ روح و جاں اب بھی
تمھاری یاد سے ہوتا ہے دل جواں اب بھی

فرشتے پوری زمین میں گھوم کر درود پڑھنے والے کا درود آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچاتے ہیں؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'اللہ کے فرشتے زمین میں گھومتے ہیں اور میری امت کی طرف سے مجھے سلام پہنچاتے ہیں۔' نیز فرمایا: 'تم جہاں بھی ہو، تمھارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے۔'

درود کا جواب بھی آپ ﷺ خود دیتے ہیں

آپ ﷺ نے فرمایا: "میری امت میں سے کوئی شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ میری روح واپس کرتا ہے تاکہ میں اس کا جواب دوں۔" (ابو داؤد و مسند احمد)۔

بالخصوص جمعہ کے دن درود کا اہتمام کرنا چاہیے؛ کیوں کہ امام احمد اور امام ابوداود نے صحیح سند سے اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'جمعہ تمھارے بہترین دنوں میں سے ہے۔ اسی دن آدم پیدا کیے گئے، اسی دن انھوں نے وفات پائی، اسی دن صور پھونکا جائے گا، اور اسی دن بے ہوشی طاری ہوگی۔ پس اس دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو، تمھارا درود مجھ تک پیش کیا جاتا ہے۔' صحابہ نے پوچھا: 'یارسول اللہ! آپ کے جسم کے گل جانے کے بعد ہمارا درود کیوں کر پیش ہوگا؟' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'اللہ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو کھانا حرام کر دیا ہے۔'

علامہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تمام انسانوں کے سردار ہیں اور جمعہ تمام دنوں کا سردار ہے۔ اس دن آپ پر کثرت سے درود پڑھنے کی خصوصی فضیلت ہے، کیوں کہ اس میں آپ کی عزت و عظمت کا بہت بڑا اظہار ہے اور امت کے لیے رحمت و برکت کا سامان ہے، اور عقل مند کے لیے یہ فضیلت چھوڑنا مناسب نہیں۔

ان بے شمار فضیلتوں کی بنیاد پر جو شخص درود نہ پڑھے وہ بہت بڑا محروم ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔' (ترمذی)

نیز فرمایا: 'اس شخص کی ناک خاک آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود نہ بھیجا۔'

جبریل علیہ السلام نے بھی ایسے شخص پر بددعا کی ہے؛ 'جس کے سامنے آپ ﷺ کا ذکر ہو اور وہ درود نہ بھیجے'، اور اس پر رسول اللہ ﷺ نے ''آمین'' کہا۔ تو ایسے شخص کی ہلاکت میں پھر کوئی دورائے نہیں۔

آئیے! آج سے درود شریف کی سوغات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روز بھیجتے ہیں اور اس کی ایک تعداد کو اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں کہ ہم پر اللہ کی رحمتیں بھی نازل ہوں، برکتیں بھی ہمارا مقدر بن جائیں، آپ ﷺ کی شفاعت اور قربِ خاص کے بھی حق دار بن جائیں اور دنیا و آخرت کے ہمارے سارے مسائل بھی حل ہوں۔

اے اللہ! اپنے حبیب ﷺ پر، ان کے اہلِ بیت اور صحابہ پر رحمتیں نازل فرما، اوّلین میں بھی، آخرین میں بھی اور قیامت تک ملأ اعلیٰ میں بھی۔

درودوں سے مجھے سیری ہو کیوں کر؟
اسی سے انبساطِ دائمی ہے
تمھارے نام کی لذت نہ پوچھو
حلاوت ہے کشش ہے دل بری ہے
محبت کے کرشمے بھی عجب ہیں
جدائی ہے تڑپ ہے بے کلی ہے
کسی پہلو قرار آئے نہ تم بن
دلِ مضطر ہے اشکوں کی جھڑی ہے

روح پرور

دلوں کا سکون و قرار ذکرِ الٰہی میں

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اللہ رب العزت نے انسان کو اپنی معرفت و عبادت کے لیے پیدا کیا، عبادت کی بنیاد ذکر ہے، ذکر کے بغیر ایمان کا پودا خشک ہوجاتا ہے، ذکر الٰہی وہ نور ہے جو دلوں کو حیاتِ جاوداں اور روح کو تازگی بخشتا ہے، اور انسان کو ہر حال میں اپنے خالق ومالک سے مربوط اور اسی کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ”ألا بذکر اللہ تطمئن القلوب“ [سورۃ الرعد: ۲۸] (خوب سمجھ لو! اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے)۔

ذکر کا مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا، اس کی بڑائی بیان کرنا، اس کی حمد وثنا کرنا، اور اس کے احکام و تعلیمات کو دل میں زندہ رکھنا، یہ زبان، دل اور عمل تینوں کا مجموعہ ہے، دل اللہ کو یاد کرے، زبان اس کی حمد پڑھے، اور عمل اس کی اطاعت کے مطابق ڈھل جائے، یہی کامل ذکر ہے۔

ذکر الٰہی سے بندوں کا فائدہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کا بہترین ذریعہ ہے، اس سے انسان کی روح کو غذا ملتی ہے جس سے انسان میں قوتِ روحانی وقوتِ ایمانی پیدا ہوتی ہے۔ اس روحانی قوت کے نتیجہ میں انسان کے لیے نفس اور شیطان سے مقابلہ کرنا آسان ہوجاتا ہے، اسی کے ساتھ گناہوں سے بچنا بھی آسان ہوجاتا ہے اور ذکر الٰہی سے نیکیوں میں اضافہ بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی رسولؓ حضرت عبد اللہ بن بسر نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! إن شرائع الاسلام قد کثرت علي، فأخبرني بشيء أتشبث به، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لایزال لسانک رطباً من ذکر اللہ“ [جامع ترمذی] (اے اللہ کے رسول! اسلام کے احکام مجھ پر بہت زیادہ ہوگئے ہیں، مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجئے جسے میں مضبوطی سے پکڑلوں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہا کرے)۔

ذکر الٰہی دل کی زندگی، ایمان کی طاقت اور سکونِ قلب کا حقیقی ذریعہ ہے، قرآن وحدیث میں اسے افضل عبادت بتایا گیا ہے، دنیا وآخرت میں ایک مومن کی خوش بختی اور کامیابی یہی ہے کہ اس کی زبان ذکر میں تر، دل اللہ کی یاد سے آباد، اور عمل اطاعت الٰہی میں مصروف ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”مثل البیت الذی یذکر اللہ فیہ والبیت الذی لایذکر اللہ فیہ، مثل الحی والمیت“ [صحیح مسلم] (جس گھر میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور جس گھر میں اللہ کا ذکر نہیں کیا جاتا ہے، دونوں کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے (یعنی ذکر والا گھر زندہ ہے اور بغیر ذکر کا گھر مردہ)۔

ذکر الٰہی کے فوائد بے شمار ہیں، اس میں دل کا اطمینان، گناہوں کی معافی، اللہ تعالیٰ کی محبت، فرشتوں کی معیت اور جنت کی آسانی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ، ویتدارسونہ بینھم الا نزلت علیھم السکینۃ، و غشیتھم الرحمۃ، وحفتھم الملائکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ“ [صحیح مسلم] (جب کوئی جماعت اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر (یعنی مسجد) میں جمع ہوکر کتاب اللہ کی تلاوت اور اس کا درس کرتی ہے، تو اس پر سکینت نازل ہوتی ہے، رحمت اسے ڈھانپ لیتی ہے، فرشتے اسے گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کا ذکر اپنی بارگاہ میں حاضر فرشتوں سے کرتا ہے)۔

ذکر دراصل مومن کی زندگی میں مانند سانس ہے، جس طرح جسم بغیر سانس کے زندہ نہیں، اسی طرح دل بغیر ذکر الٰہی کے زندہ نہیں رہ سکتا، ذکر زندگی کو روشن کرتا ہے، دل کو جگمگاتا ہے، کردار کو پاکیزہ بناتا ہے، اور انسان کو رب سے قریب کرتا ہے۔

ذکر الٰہی کے جتنے بے شمار عظیم فضائل ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو اتنا ہی آسان کردیا ہے کہ اس کے لیے رب کریم نے کوئی شرط عائد نہیں فرمائی، اگر باوضو قبلہ رخ ہوکر یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ ذکر کرسکتے ہیں تو یہ افضل ہے، یہ عظیم عبادت چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے بھی ادا کی جاسکتی ہے، اسی کے ساتھ ایک مومن کو توبہ واستغفار، اور اپنے ہر عمل میں استحضارِ نیت کو حرزِ جاں بنانا چاہئے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اپنی یاد دل میں بسانے کا شوق دے، اور ہم سب کو ہر حال میں ذکر کرنے، اپنی یاد میں جینے، اور اپنی ہی یاد میں دنیا سے جانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

مجلس تحقیقاتِ شرعیہ، ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والی چند مطبوعات

سالِ گذشتہ ۲۰۲۴ء میں بتاریخ ۳۰؍نومبر و یکم دسمبر مجلس تحقیقاتِ شرعیہ، ندوۃ العلماء نے اپنا سالانہ فقہی سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار کا محورِ بحث عصرِ حاضر کے تین اہم فقہی موضوعات تھے: نمبر ایک: "مبیع معدوم کی جدید صورتیں"، نمبر دو: "'یسر وتیسیر' اور عصرِ حاضر کے تقاضے"، نمبر تین: "جانوروں کی مصنوعی افزائش-شرعی احکام"۔

حسبِ معمول ان موضوعات پر سوالنامے تیار کرکے اربابِ بحث وتحقیق کو ارسال کیے گئے تھے، جن میں ہندوستان کے مختلف مکاتبِ فکر اور مدارسِ اسلامیہ وافتاء وقضا کے اداروں سے وابستہ شخصیات شامل تھیں۔ ان حضرات نے سوال ناموں کی روشنی میں ان موضوعات پر جو تحقیقی مقالات پیش کیے تھے، وہ مقالات جمع وترتیب کے مرحلہ سے گذر کر اب کتابی شکل میں منظرِ عام پر آچکے ہیں، اور امسال کے سیمینار میں ان کی رونمائی بھی ہوگئی ہے۔

چونکہ تین اساسی موضوعات تھے، لہذا ہر موضوع سے متعلق مقالوں کو الگ جلد میں جمع کیا گیا، اور وہ موضوع اس جلد کا عنوان قرار پایا۔

ذیل میں ہم ان تینوں کتابوں کی تفصیلات پیش کررہے ہیں:

۱- جانوروں کی مصنوعی افزائش-شرعی احکام

ملحوظ رہے کہ عصرِ حاضر میں غذائی ضرورت کی فراہمی کے لیے، جس کو عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو اس کا ایک بڑا حصہ جانوروں کا ہے، افزائشِ نسل کے مصنوعی طریقے ایجاد کیے گئے ہیں، اور فی الوقت بازار میں مرغ وماہی کی فارمنگ سے یافت شدہ غذا کی بھرمار ہے۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح سے دوا اور تکنیک کے ذریعہ کثیر مقدار میں خوردنی مواد حاصل کرنا شریعت کی رو سے کیسا ہے؟ اسی مسئلہ کو لے کر جن علمائے شریعت نے مصادرِ شریعت کی روشنی میں تفصیلی مقالوں کی شکل میں اپنی تحقیقات پیش کی ہیں، ان کے اسمائے گرامی اور عناوینِ مقالات درج ذیل ہیں:

۱- مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی (جانوروں کی مصنوعی افزائش)، مفتی اختر امام عادل قاسمی (حیوانی کلوننگ اور جانوروں کی مصنوعی افزائش)، مفتی راشد حسین ندوی (جانوروں کی مصنوعی افزائش کے شرعی جوابات)، ڈاکٹر شاہ محمد شاہ جہاں ندوی (جانوروں کی مصنوعی افزائش کے احکام و مسائل)، رحمت اللہ ندوی (جانوروں کی مصنوعی افزائش کا شرعی حکم)، مفتی محمد ذاکر نعمانی (جانوروں کی مصنوعی افزائش)، مفتی محمد عثمان بستوی (لحمی غذائی مصنوعات کی تکثیر کا مسئلہ)، مولانا عبید اللہ ندوی (جانوروں کی مصنوعی افزائش اور چند مباحث)، مولانا جنید احمد قاسمی (جانوروں کی مصنوعی افزائش)، ڈاکٹر محمد عاشق صدیقی ندوی (جانوروں کی مصنوعی افزائش)۔

۲- "مبیع معدوم کی جدید صورتیں"

شریعتِ مطہرہ میں خرید وفروخت کے معاملات کی جملہ شرائط میں ایک اہم شرط یہ ہے کہ جس کی چیز کی خرید وفروخت کی جارہی ہے وہ 'معدوم' نہ ہو، یعنی اس کا حسی وجود ہو اور وہ Exist کرتی ہو۔ عصرِ حاضر میں جہاں تجارت کے میدان میں بڑا انقلاب آیا ہوا ہے، اور خرید وفروخت اور معاملات کی ایسی ایسی شکلیں سامنے آگئی ہیں اور مسلسل آتی جارہی ہیں، جن کا پہلے کبھی وجود تو کیا تصور بھی نہیں تھا۔ ان میں سے بعض شکلیں ایسی بھی ہیں جو بہ ظاہر شریعت کی مذکورہ بالا شرط کو پورا نہیں کرتیں؛ لیکن وہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہیں، مثلاً: کمپیوٹر پروگرامز، ایپلیکیشنز اور سافٹ ویرز وغیرہ۔

اس سلسلہ میں شریعت کی رہنمائی میں تفصیلی مقالات کے ذریعہ اپنی رائے کا اظہار کرنے والوں میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسمائے گرامی مع عنوانِ مقالہ شامل ہیں:

مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی (بیع معدوم کی چند جدید صورتیں)، مفتی جنید عالم ندوی قاسمی (بیعِ معدوم سے متعلق شرعی احکام)، مولانا بدر احمد مجیبی (بیع معدوم)، مفتی محمد عثمان بستوی (ایضا)، مفتی جمیل احمد نذیری (بیع معدوم کی چند صورتیں)، مفتی اختر امام عادل قاسمی (بیع معدوم کی چند جدید شکلیں)، مفتی عبد الرزاق قاسمی (ایضا)، مفتی امانت علی قاسمی (ایضاً)، مفتی جنید احمد قاسمی (ایضا)، مفتی شاہ جہاں ندوی (ایضا)، مفتی فیاض احمد برمارے (ایضا)، مولانا ابوسعد نور قاسمی (بیع معدوم کی چند جدید صورتیں اور ان کے احکام)، مفتی ذاکر نعمانی (بیع معدوم)، مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی (بیع معدوم کی چند جدید صورتیں)، مفتی محمد اشرف قاسمی (بیع معدوم کا مفہوم)، مولانا صابر حسین ندوی (بیع معدوم اور اس کی شکلیں)، مولانا انیس ندوی (ایضاً)، مولانا عبید اللہ ندوی

(بیع معدوم کی کچھ جدید صورتیں)۔

یہ دونوں مجموعہائے مقالات' جن کی ترتیب و تبویب کا عمل بالترتیب جناب رحمت اللہ ندوی اور مفتی نصر اللہ ندوی صاحبان اساتذہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے انجام دیا ہے، کل پانچ ابواب پر مشتمل ہیں؛ پہلے باب میں: تمہیدی مباحث، سوالنامہ، تجاویز، تلخیص مقالات اور عرضِ مسئلہ مذکور ہے۔ اول الذکر میں تلخیصِ مقالات مفتی سید مسعود حسن حسنی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء، اور عرضِ مسئلہ ڈاکٹر محمد فہیم اختر کے قلم سے ہے، جب کہ ثانی الذکر میں تلخیص مفتی محمد نصر اللہ صاحب اور عرض مسئلہ جناب مفتی راشد حسین صاحب نے تحریر کیا ہے۔

دوسرے باب میں تفصیلی مقالات کو، تیسرے باب میں متوسط مقالات کو، جب کہ چوتھے باب میں مختصر تحریروں کو پیش کیا گیا ہے۔ پانچواں اور آخری باب سیمینار میں پیش آنے والے مناقشہ کی اہم گفتگو سے عبارت ہے۔

۳-''یسر و تیسیر اور عصرِ حاضر کے تقاضے''

اسلام کی آفاقیت وہمہ گیری کا ایک بڑا مظہر فقہِ اسلامی کا ایک مسلمہ اصول 'یسر' و 'تیسیر' یعنی سہولت پیدا کرنے کا ہے۔ کتاب وسنت میں ہمیں اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ دین کو آسان اور قابلِ عمل بنا کر پیش کرو۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جس کو جہاں دین پر عمل مشکل نظر آ رہا ہو وہاں وہ دین کا حکم ہی ترک کر دے، یا اس کا حسبِ خواہش وہوائے نفس بدل لے آئے۔ ظاہر ہے اس سے دین میں تحریف کا دروازہ کھل جائے گا، اور دینِ محمدی کا بھی وہی حشر ہوگا جو دیگر ادیان کا ہوا۔ البتہ کچھ اس کے کچھ اصول وضوابط ہیں، جن کو بروئے کار لاکر شریعت کو ہر دور، ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے قابلِ عمل ثابت کیا جاسکتا ہے۔ یہ اصول ہمیشہ فقہائے اسلام کے مدنظر رہا ہے، اور انھوں نے افتاء و قضا کے میدان میں اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے، جس کی وجہ سے آج بھی دینِ اسلام اور شریعتِ محمدی (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) اپنی معنویت وافادیت کے ساتھ سرمدیت کے مقام پر فائز ہے۔

ان مقالات میں جو''جو یسر وتیسیر اور عصرِ حاضر کے تقاضے'' کے عنوان کے تحت تحریر وجمع کیے گئے ہیں' اہلِ علم نے 'یسر وتیسیر' کے باب میں شریعت کی حدود وقیود سے بحث کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے ان مسائل سے بحث کی ہے جو اس کے تحت آسکتے ہیں، اور اس ضابطہ کی رو سے ان کو مباح قرار دیا جاسکتا ہے، یا ان کے جواز کی بات کہی جاسکتی ہے۔

اس مجموعۂ مقالات کی ترتیب جناب منور سلطان ندوی نے انجام دی ہے، جو کچھ اس طرح ہے:

مقدمہ، پیش لفظ، عرضِ مرتب، افتتاحی نشست کے چند اہم خطابات، تمہیدی مباحث، مقالات اور مناقشہ۔ اس موضوع کے مقالات کی تلخیص ڈاکٹر محمد علی شفیق ندوی صاحب اور عرضِ مسئلہ جناب مولانا مفتی محمد ظفر عالم ندوی اساتذۂ دار العلوم ندوۃ العلماء نے رقم کیا ہے۔

اس اہم موضوع پر جو تحقیقی مضامین پیش کیے گئے ہیں' ان کے عناوین مع مقالہ نگار حسبِ ذیل ہیں:

''یسر سے متعلق اصول واحکام: دورِ حاضر کے تقاضوں کے تناظر میں'' (مولانا ڈاکٹر اقبال مسعود ندوی)، ''یسر وتیسیر اور عصرِ حاضر کے تقاضے'' (مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی)، ''تیسیر - اسلامی شریعت کی اہم بنیاد'' (مولانا محمد رضی الاسلام ندوی)، ''یسر وتیسیر اور عصرِ حاضر کے تقاضے'' (مولانا نذیر احمد کشمیری)، ''ایضاً'' (مولانا ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی)، ''ایضاً'' (مفتی حبیب اللہ قاسمی)، ''ایضاً'' (مفتی احمد دیولوی)، ''تیسیر کا معنی اور اس کی حکمت'' (مولانا خورشید احمد اعظمی)، ''یسر وتیسیر اور عصرِ حاضر کے تقاضے'' (مولانا ڈاکٹر کلیم اللہ عمری مدنی)، ''اسلام میں یسر وتیسیر کا مفہوم اور اس کی حیثیت'' (مولانا محمد حسن ندوی)، ''شریعت میں یسر وتیسیر اور عصرِ حاضر کے تقاضے'' (مولانا عبید اللہ ندوی)، ''یسر وتیسیر اور عصرِ حاضر کے تقاضے'' (مفتی محمد ذاکر نعمانی)، ''ایضاً'' (مولانا محمد صابر حسین ندوی)، ''ایضاً'' (مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی)، ''ایضاً'' (مولانا جنید احمد قاسمی)، ''ایضاً'' (مولانا عبید الرحمان قاسمی)، ''ایضاً'' (مولانا سعود ممتاز ندوی)، ''اسلام میں یسر وتیسیر کا مفہوم اور اس کی حقیقت'' (مولانا اسجد حسن ندوی)۔

ان تینوں مجموعوں کی ترتیب و تبویب اور مشمولات کی خصوصیت کہی جاسکتی ہے کہ پورے سیمینار کا دورانیہ، اس کی سرگرمیاں، اور اس کے فوائد ونتائج کا ایک اجمالی منظرنامہ ایک سرسری نظر ڈالنے پر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے، اور ان مقالوں کے مطالعہ سے عصرِ حاضر کے جدید مسائل اور شریعتِ مطہرہ کے عطا کردہ اصول وضوابط اور تعلیمات کو علی وجہ البصیرۃ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مقدمات' میر کارواں حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے قلمِ گوہر بار سے ہیں، جو بڑے فکر انگیز اور رہنما ہیں، پیشہائے لفظ' مجلس تحقیقاتِ شرعیہ ندوۃ العلماء کے روحِ رواں استاذِ محترم جناب مولانا عتیق احمد بستوی کا نتیجۂ فکر ہیں، جو ان کی فقہی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ تینوں ہی مجموعوں کی اشاعت عمدہ کتابت وسیٹنگ اور عمدہ طباعت کے ساتھ ہوئی ہے۔

یاد رہے کہ اس سیمینار کی تجاویز 'تعمیر حیات' ۲۵/دسمبر ۲۰۲۴ء کے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے۔

حصول کتب کے لیے مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام ندوۃ العلماء، مکتبہ ندویہ احاطہ ندوۃ العلماء اور مکتبہ احسان نزد شباب مارکیٹ ندوہ روڈ سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

علم وعمل

قوتِ فکروعمل پہلے فنا ہوتی ہے

محمد انصار ندوی (مدھوبنی)

آزادی ایک نعمت ہے جس کی قدر وہی قوم جان سکتی ہے جس نے غلامی کی زنجیروں میں سسکتے ہوئے سانس لی ہو۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جسمانی آزادی اگر ذہنی غلامی سے ہمکنار ہو جائے تو ایسی آزادی محض فریبِ نظر رہ جاتی ہے۔ قومیں جب اپنی زمینیں واپس لے لیتی ہیں مگر اپنی فکر، اپنی روح، اپنی تہذیب، اور اپنی تعلیمی بنیادیں کھو بیٹھتی ہیں، تو وہ آزاد کہلانے کی مستحق نہیں رہتیں۔ یہ دورِ جدید کی وہ سچائی ہے جس پر ہر صاحبِ فکر کو غور کرنا چاہئے۔

ہم نے غلامی کی تاریخ دیکھی ہے، جسمانی زنجیریں ٹوٹی ہیں مگر ذہنی زنجیریں اب بھی صدیوں کی طرح پیوست ہیں۔ برصغیر کی غلامی کا سب سے گہرا زخم وہ نہ تھا جو تلواروں سے لگا، بلکہ وہ جو کلمۂ فکر اور نظامِ تعلیم کے ذریعے لگا۔ لارڈ میکالے نے جب ہندوستان میں اپنی تعلیمی پالیسی نافذ کی تو مقصد صرف انگریزی زبان یا مغربی علوم کی ترویج نہ تھا بلکہ ایک ایسی نسل تیار کرنا تھی جو رنگ میں ہندوستانی مگر ذہن و مزاج میں انگریز ہو۔ اس نے کہا تھا کہ ہمیں ایسے لوگ چاہیے جو ہماری رعایا ہوں مگر ہمارے مفادات کے نگہبان۔ یوں علم کے نام پر ذہن کی غلامی کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے اثرات آج تک باقی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

آزادی کی اصل روح ایمان، خودی، اور فکری خودمختاری میں پوشیدہ ہے۔ مغرب نے جب مشرق پر علمی وفکری غلبہ حاصل کیا تو سب سے پہلے انسان کی روح کو مادیت کے طوفان میں ڈبو دیا، آزادی کا مفہوم بدل دیا گیا۔ اب آزادی کا مطلب اخلاقی ضبط سے نجات، حدود سے بغاوت، اور خواہشات کی بندگی قرار پایا۔ مغرب نے ترقی کے نام پر انسان کو مشین بنا دیا، اور تہذیب کے نام پر انسانیت کی بنیادوں کو کمزور کیا۔

مغرب کی ننگی تہذیب کا اثر سب سے زیادہ مشرقی معاشروں کے اخلاق پر پڑا۔ وہ معاشرہ جو شرم وحیا، عفت وعصمت، اور خاندانی نظام کے محافظ تھے، رفتہ رفتہ مغربی طرزِ زندگی کے زیرِ اثر اپنی بنیادیں کھونے لگے۔ میڈیا، تعلیم، اور جدید مواصلات نے اس حملے کو مزید گہرا کیا۔ اب انسان جسمانی طور پر آزاد ضرور ہے مگر فکری و اخلاقی لحاظ سے مغرب کا غلام بن چکا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے کہا تھا:

”یہ مغربی تہذیب انسان کو علم تو دیتی ہے مگر دل سے ایمان چھین لیتی ہے۔ وہ عقل کو بیدار کرتی ہے مگر روح کو مردہ کر دیتی ہے۔“ آج یہی مغربی فکر ہمارے تعلیمی اداروں میں، ہماری زبانوں میں، اور ہمارے خوابوں میں سرایت کر چکی ہے۔ ہمارے نوجوان اب اپنی تاریخ کو پسِ پشت ڈال کر مغرب کی تقلید میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ ذہنی غلامی کا سب سے خطرناک پہلو ہے، وہ غلامی جو غلام کو غلامی کا احساس ہی نہیں ہونے دیتی۔

اسلام نے انسان کو سب سے پہلے فکری آزادی عطا کی، اس نے کہا کہ تمہارا رب تمہارا خالق ہے، کسی انسان کے سامنے جھکنا تمہاری شان نہیں۔ اسلام نے عقل کو قید نہیں کیا بلکہ اسے روشنی دی۔ قرآن نے سوال کرنا سکھایا، غور وفکر کی دعوت دی، اور انسان کو یاد دلایا کہ حقیقی آزادی اللہ کی بندگی میں ہے، نہ کہ خواہشات کے پیچھے بھاگنے میں۔

جب مسلمانوں نے اس تعلیم پر عمل کیا تو اندلس و قرطبہ کی گلیاں علم و ہنر کی روشنی سے جگمگانے لگیں۔ یورپ جب تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا، تب مسلمان اندلس میں ریاضی، فلسفہ، طب، اور فنِ تعمیر میں دنیا کی رہنمائی کر رہے تھے۔ وہاں علم عبادت سمجھا جاتا تھا، اور عبادت علم کا چراغ بنتی تھی۔ مگر جب مسلمانوں نے اپنی فکری خودی کھو دی، مغرب کی تقلید میں فخر سمجھنے لگے، تو وہ زوال کی کھائی میں جا گرے۔

یہ وہی مغربی تہذیب ہے جس نے آزادی کے نام پر عریانیت کو فروغ دیا، عورت کو زینتِ بازار بنایا، اور اخلاق کو محض ذاتی رائے قرار دیا۔ آج کے نوجوان مغرب کی موسیقی، فیشن، اور فلموں میں محو ہیں، مگر اپنی تہذیبی شناخت سے غافل۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ترقی مغرب کی نقل میں ہے، حالانکہ ترقی اپنی شناخت کو قائم رکھتے ہوئے حاصل کی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کا مشرق اپنی روح سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ ہم اپنی زبانوں، اپنے لباسوں، اپنی تعلیم، حتیٰ کہ اپنی سوچ تک میں مغرب کے محتاج ہیں۔ اقبال نے جس ”خودی“ کی تعلیم دی تھی وہ آج ہمارے نصاب سے غائب ہے، ہمارے دلوں سے مٹ چکی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ”قوموں کی بقا صرف ہتھیاروں سے نہیں بلکہ فکر

کی قوت سے ہوتی ہے۔ اگر فکر مغلوب ہو جائے تو جسم کی آزادی بے معنی ہو جاتی ہے۔'' ان کی یہ بات آج کی دنیا میں حرفِ آخر لگتی ہے۔ کیونکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان ملک سیاسی طور پر آزاد ہیں مگر فکری طور پر مغربی نظامِ تعلیم، مغربی میڈیا، اور مغربی فلسفۂ حیات کے تابع ہیں۔

اندلس کی مثال ہمارے سامنے ہے، جب مسلمان وہاں کے حکمران تھے تو علم، اخلاق، اور تہذیب کا عروج تھا؛ مگر جب فکری زوال آیا تو سب کچھ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ آزادی صرف اقتدار کا نام نہیں بلکہ شعورِ خودی کا نام ہے، اور یہی شعور آج ہمارے معاشرے سے رخصت ہو چکا ہے۔

اندلس کے زوال کے بعد مسلمانوں نے کبھی سوچا کہ وہ کیوں ہارے؟ کیا ان کی مسجدیں چھوٹی تھیں؟ کیا ان کی فوج کمزور تھی؟ نہیں۔ شکست اس وقت شروع ہوئی جب مسلمان علم کی روح کھو بیٹھے، علم کو عبادت کی بجائے کسبِ معاش کا ذریعہ بنا لیا، اور مغربی فکر کو معیارِ ترقی سمجھنے لگے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ذہن غلام ہوا، اور قوم رفتہ رفتہ زوال کے اندھیروں میں کھو گئی۔ مغربی تہذیب نے انسان کو بظاہر آزاد کیا مگر درحقیقت اسے خواہشات کا غلام بنا دیا۔ اس آزادی کا انجام اخلاقی انحطاط اور روحانی افلاس کی صورت میں ظاہر ہوا۔ آج مغرب کے تمدن میں مادّی ترقی کی چمک ضرور ہے مگر دل کی تاریکی، خاندانی نظام کی تباہی، اور اخلاقی بربادی نے اس تہذیب کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ وہاں جسم آزاد ہیں مگر روحیں بے چین، ذہن روشن ہیں مگر دل مردہ!

اسلامی مفکرین نے ہمیشہ تنبیہ کی کہ مغرب کی ظاہری ترقی کے پیچھے دو خطرناک بیماریاں چھپی ہیں، روح کی بے نوری اور اخلاق کی بے سمتی۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے کہا تھا کہ ''مغربی تہذیب نے انسان کو آسمان سے توڑ کر زمین سے باندھ دیا ہے۔ اس نے دل سے خدا کو نکال کر نفس کو خدا بنا دیا ہے۔'' ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے الفاظ میں، ''اسلام نے علم کو خدمتِ خلق سے جوڑا، جبکہ مغرب نے علم کو تسخیر و تسلط کا ذریعہ بنایا۔''

مغربی تعلیم کا مقصد انسان کو انسان بنانا نہیں بلکہ ''کارآمد پرزہ'' بنانا ہے۔ یہی لارڈ میکالے کا خواب تھا، ایسی نسل جو مشینی نظام کے لیے موزوں ہو مگر خود فکر و روح سے خالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی ممالک میں تعلیم کا رشتہ اخلاق سے ٹوٹ گیا، علم تجارت بن گیا، استاد محض نوکر اور شاگرد محض گاہک بن گیا۔ سید سلیمان ندوی نے اس زوال کو دیکھ کر فرمایا تھا: ''ہماری نئی نسلوں کے دلوں میں مغربی علم کی روشنی تو ہے مگر ایمان کی گرمی نہیں۔ یہ علم اگر دل کے چراغ سے نہ جلے تو انسان کو اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دیتا''۔

آج ہمارا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ ہم نے اسلام کے علم کو ترک کر کے مغرب کی تقلید شروع کر دی۔ ہم نے قرآن کے نظامِ فکر کو چھوڑ کر مغربی فلسفے کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ اور اس دوڑ میں ہم نے اپنے آپ کو کھو دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ہم مغرب بن سکے نہ مشرق رہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ انسان کی اصل عزت عبودیتِ الٰہی میں ہے، آزادی خواہشات کی غلامی میں نہیں۔ اسلام کی فکری بنیادیں عدل، علم، اخلاق، اور توازن پر قائم ہیں۔ مغرب نے ان بنیادوں کو توڑا اور کہا کہ ''انسان خود مختار ہے''، مگر اس خود مختاری نے انسان کو خدا سے دور کر دیا اور روح کو بے مقصد۔

موجودہ دور کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان دوبارہ فکرِ اسلامی کو مرکزِ تربیت بنائیں۔ ہماری تعلیم محض روزگار کے لیے نہیں بلکہ کردار کے لیے ہو۔ ہمارے میڈیا، ہمارے نصاب، اور ہمارے ادارے مغرب کی اندھی تقلید سے نکل کر اپنی فکری بنیادوں پر کھڑے ہوں۔ ہمیں اپنی زبانوں، اپنے فلسفے، اور اپنی تاریخ سے دوبارہ جڑنا ہوگا۔ ہمیں اندلس کے کھنڈرات سے یہ سبق لینا ہوگا کہ جس قوم نے علم کو دولت اور عقل کو غلامی میں بدل دیا، وہ ہمیشہ زوال کا شکار ہوئی۔ علم اگر ایمان کے بغیر ہو تو شیطان کا ہتھیار بن جاتا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے کہا تھا: ''دنیا کی قومیں اپنی عقل سے زندہ ہیں، مگر مسلمان اپنی وحی سے زندہ ہے۔ اگر وہ وحی سے رشتہ توڑ لے تو وہ مٹی کے پتلے سے زیادہ کچھ نہیں۔''

یہی وہ پیغام ہے جو اقبال نے دیا، یہی وہ درس ہے جو قرآن دیتا ہے، اور یہی وہ راہ ہے جو امت کو غلامی سے نکال سکتی ہے۔ مغرب کی چمک دمک میں کھو جانے کے بجائے ہمیں اپنی روحانی روشنی پر یقین رکھنا ہوگا۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

قوموں کی زندگی میں زوال کا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ اپنی اقدار پر شرمندہ ہونے لگتی ہیں۔ آج ضرورت ہے کہ ہم اپنی تہذیب پر فخر کریں، اپنی زبان کو عزت دیں، اپنے علم کو ایمان سے جوڑیں۔ یہی حقیقی آزادی ہے کہ انسان اپنے رب کے سوا کسی کے سامنے سر نہ جھکائے۔

اگر ہم نے اپنی فکری غلامی کی زنجیریں نہ توڑیں تو آنے والی نسلیں صرف اتنا پوچھیں گی: ''ہمارے پاس زمین تو تھی، مگر ہم نے اپنی روح کیوں کھو دی؟''۔

حق و باطل

بین المذاہب

آفاقیت ومقامیت کی کش مکش

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

مذہب انسان کی بنیادی ضرورت اوراس کی سب سے بڑی قوت ہے،لیکن اگر مذہب کواس کے حقیقی تناظر میں نہ دیکھا جائے تو مذہب انسان کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے اورانسانیت کی تباہی کا سامان بھی،اور یہ سنگین وپیچیدہ صورتحال اس وقت شدت اختیار کرجاتی ہے جب حقیقی مذہب کے نام پر اوہام وخرافات اور انسانی ذہنوں کے تیار کردہ مجموعۂ عقائد کی پیروی کی جاتی ہے یا کسی وقتی یا مقامی مذہب کو دائمی اور آفاقی سمجھ کر اس کی اشاعت اور اس کے نفاذ پر طاقت ووسائل صرف کیے جاتے ہیں۔

مذاہب عالم کی تاریخ کا یہ ایک بنیادی پہلو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عمومی طور پر مخصوص علاقہ یا مخصوص زمانہ یا مخصوص قوم کے لیے انبیاء کو مبعوث کیا،لیکن دنیا کی کئی قوموں اور ملتوں نے اپنے مذہب کی اس مقامیت اور اس کی مخصوص زمانیت کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا،اور اپنی ساری صلاحیتیں اس وقتی اور عارضی مذہب کو آفاقی اور دائمی مذہب ثابت کرنے میں صرف کردیں،جس کا منطقی اور لازمی نتیجہ بین المذاہب ٹکراؤ کی شکل میں ظاہر ہوا۔

آج عالمی سطح پر مذہب کے نام پر جو کشت وخون کا بازار گرم ہے اس کی بنیادی وجہ یہی طرز فکر اور محدود ومقامی مذہب کی آفاقیت و دائمیت پر یہی اصرار ہے۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو موجودہ آسمانی و عالمی مذاہب میں یہودیت کی تاریخ نہایت قدیم بھی ہے اور انقلابات سے بھرپور بھی۔البتہ اپنی طویل عمر اور تاریخی وسعت کے باوجود اس کی شریعت کا دورانیہ محدود تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے ساتھ ہی سابقہ شریعت منسوخ ہوگئی۔لیکن یہودیوں نے اس حقیقت کو قبول کرنے کے بجائے ہٹ دھرمی اختیار کی اور اپنے مذہب کو دائمی و آفاقی ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کیے، انہوں نے سازشیں رچیں،خون ریزی کی اور اپنے مذہبی غلبے کو قائم رکھنے کے لیے بے شمار انسانی جانیں ضائع کیں،حتیٰ کہ اپنی دانست میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی تک پہنچانے میں بھی کوئی تامل نہ کیا۔اس کے بعد یہودیت اور عیسائیت ایک دوسرے پر اپنی برتری اور حقانیت ثابت کرنے کے لیے مسلسل باہم متصادم رہیں، جس کا نتیجہ انسانی جانوں کے ضیاع کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔

عیسائیت کی اصل حیثیت بھی ایک مقامی اور زمانی مذہب کی تھی،لیکن اس کے پیروکار آج تک اسے ایک آفاقی دین کا درجہ دیتے ہیں۔وہ عالمی سطح پر اس تاریخی مذہب کو قبولِ عام دلانے کے لیے کوشاں ہیں اور اس مقصد کے حصول میں بھرپور وسائل کے ساتھ بعض اوقات عسکری قوت کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتے۔اس طرزِ عمل کا ناگزیر نتیجہ شدید نوعیت کے تصادم اور خطرناک تباہ کاریوں کی صورت میں دنیا کے سامنے آرہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ عیسائیت بحیثیت مجموعی یورپ کا ایک ''نسلی تجربہ'' بن کر رہ گئی۔کلیسا کو تقدس کا مقام حاصل ہوا اور فادرز کو گناہوں کی معافی یا سزا دینے جیسے اختیارات تفویض کر دیے گئے، نتیجتاً پاپائیت نے مذہب کے نام پر پوری قوم کو عملاً اپنا اسیر بنالیا۔ اس جبر کے خلاف بغاوتوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا، جس کے باعث عیسائیت متعدد فرقوں میں تقسیم ہوگئی، اور ہر فرقہ طویل عرصے تک ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہا۔

عیسائیت کی اصلاح کے لیے مختلف فکری اور خونریز تحریکیں اٹھیں،مگر تمام کوششوں اور قربانیوں کے باوجود عیسائیت آج بھی اپنے سابقہ نسلی امتیازات پر قائم ہے۔حتیٰ کہ ویٹی کن سٹی میں سب سے بڑے پادری کا منصب بھی عملاً اسی یورپی،سفید فام طبقے کے لیے مخصوص رہا ہے۔نسلی امتیاز پر قائم کوئی مذہب زمانے کے بدلتے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یہی وجہ ہے کہ جب یورپ میں اسلام کی علمی و تحقیقی روشنی سائنس کی صورت میں نمودار ہوئی تو عیسائیت نے اسے مذہب مخالف قرار دیا۔اس کے نتیجے میں سائنس دانوں پر شدید ظلم وستم ہوئے انہیں زندہ جلایا گیا اور اپنے نظریات سے رجوع کرنے پر مجبور کیا گیا۔تاہم علمی قوت بڑھتی رہی،اور بالآخر وہ وقت آیا جب عیسائیت کو جدیدیت کے سامنے پسپائی اختیار کرنا پڑی اور عقائد میں مختلف نوعیت کے سمجھوتوں کی راہیں نکالنی پڑیں۔اس کے بعد عیسائیت تمام مغربی دنیا میں محض فرد کا ذاتی معاملہ بن کر رہ گئی اور ریاستی و اجتماعی امور سے اس کا اثر و رسوخ تقریباً ختم ہوگیا، یوں عیسائیت بدلتے ہوئے حالات میں خود کو از سرِ نو دریافت کرنے میں ناکام رہی، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس کی شریعت ایک محدود دور اور خاص تاریخی عہد کے لیے مقرر کی گئی تھی۔

ہندوستان میں ویدک سناتن دھرم کے کچھ

پیروکاروں نے بھی شدت کے ساتھ اسی نظریے کو اختیار کیا اور ایک محدود، غیر آفاقی مذہب کو قومی وملکی شناخت کے طور پر نافذ کرنے کی کوشش کی۔ یوں ایک کمزور اور بے روح مذہبی سانچے کو از سرِ نو زندہ کر کے معاشرے کے باشعور اور حساس طبقات پر مسلط کرنے کی سعی کی گئی۔ اس مقصد کے لیے مختلف تحریکیں منظم کی گئیں، سنگین نوعیت کے منصوبے تیار ہوئے، اور متعدد قانونی اقدامات کے ذریعے عوام کو دباؤ اور خوف کا شکار بنایا گیا۔ اس کے نتیجے میں مذہب کے نام پر شدید باہمی تصادم نے جنم لیا اور اپنی ہمہ جہت صلاحیتوں کے باوجود یہ ملک ترقی و استحکام کی دوڑ میں مسلسل پیچھے دھکیل دیا گیا۔

سناتن دھرم اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مقامی اور محدود زمانی مذہب تھا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے بھی ہوتا ہے کہ جب اس مذہب کا مخصوص دورانیہ مکمل ہوا تو آریاؤں کے ایک طبقے نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا اور اپنے مفادات کے پیشِ نظر اس کے ماننے والوں میں ذات پات کی عصبیت کو فروغ دیا۔ اس کے نتیجے میں پورا مذہبی و سماجی ڈھانچہ چار خانوں میں تقسیم کر دیا گیا:

(۱) برہمن: مذہبی پیشوا (۲) چھتری: جنگجو طبقہ (۳) ویش: زراعت وتجارت پیشہ طبقہ (۴) شودر: خدمت گزار طبقہ۔

بعد ازاں یہ تقسیم رفتہ رفتہ ایک خاندانی و نسلی نظام کی صورت اختیار کر گئی، جس کے باعث نسلی برہمنوں کے ہاتھوں نسلی شودر یعنی دلت طبقات کی زندگی مسلسل اذیت ناک بنتی رہی۔ اسی نسلی امتیاز نے سناتن دھرم کی افادیت اور معنویت کو بتدریج ختم کر دیا، اور اس کے پیروکار اپنی نسل کے تحفظ اور وجود کی بقا کے مسائل میں ایسے الجھ گئے کہ سماجی و فکری سطح پر ان کی قوتِ مدافعت شدید کمزور پڑ گئی۔ پھر جب یہاں عرب آئے، مغل آئے، انگریز آئے تو یہاں کا سناتن دھرم ان میں کسی کی مزاحمت نہ کر سکا۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ دنیا کے قدیم مذاہب میں شامل ہونے کے باوجود آج اس کا نہ کوئی سیاسی مرکز ہے اور نہ تہذیبی گہوارہ! بلکہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس مذہب کی تعلیمات بھی غیر مرتب وغیر مدون ہیں حتیٰ کہ اس مذہب میں داخل ہونے کی شرطیں اور اس کا طریقۂ کار نیز نئے افراد کی طبقاتی حد بندی بھی موجود نہیں ہے، اس کے باوجود اس مذہب کے ٹھیکیدار اسے ملکی اور پھر عالمی سطح پر نافذ کرنے کے آرزومند ہیں۔

تین معروف عالمی مذاہب کے علاوہ چوتھا عالمی مذہب اسلام ہے۔ اسلام نے جو ہمہ گیر نظامِ زندگی اور جامع دستور العمل پیش کیا، اس سے اس کی عالمگیریت اور لامکانیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مختلف خطوں اور مختلف ادوار میں اسلام نے اپنی غیر محدودیت، ہمہ گیر صلاحیت اور آفاقی حیثیت کو مسلسل ثابت کیا ہے۔ مذاہبِ عالم کی تاریخ میں یہ واحد مذہب ہے جس نے نہ صرف تمام سابقہ مذاہب اور نظام ہائے زندگی کے باطل ہونے کا واضح اعلان کیا بلکہ عملی میدان میں ان کے نقائص و ناکامی اور اپنی افادیت، جامعیت اور برتری کو بھی ثابت کر دکھایا۔

اسلام کی آفاقیت کی روشن دلیل یہ ہے کہ اگرچہ اس کا ظہور عرب کے ریگزاروں میں ہوا، مگر اس کی کرنوں نے پوری دنیا کے خطوں کو منور کر دیا۔ اسے ہر جگہ بغیر کسی رکاوٹ، اور بغیر کسی نسلی یا تہذیبی امتیاز کے قبولیتِ عامہ حاصل ہوئی۔ آج بھی، سیاسی یا عسکری غلبے کے بغیر، اس کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت اس کی افادیت، ہمہ گیریت اور عالمگیریت کا واضح ثبوت ہے۔

آج ملکی و عالمی سطح پر مذہب کے نام پر تصادم کی بنیادی وجہ یہی آفاقیت ومقامیت کی کشمکش ہے، یہودیت نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ آفاقی مذہب ہے بلکہ کسی کو اس مذہب میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں ہے، لیکن اپنی دائمیت اور افادیت پر اس کو اصرار ہے اور سبھی مذاہب کو وہ اپنا خوشہ چیں دیکھنے کا خواہش مند، یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح پر بین المذاہب تصادم کے پس پردہ اسی کی تخریبی سازشیں ہی کارفرما ہیں۔ عیسائیت کو اپنی آفاقیت پر ضد ہے لیکن اس کی حقیقت اور افادیت سے وہ بالکل خالی ہے، بلکہ اس میں اتنی مضبوطی بھی نہیں کہ حالات کے چیلنجز کے سامنے وہ ٹک سکے، رہی بات سناتن دھرم کی تو اس کے پاس نہ آفاقیت اور نہ دائمیت ہے اور نہ ہی ایسے کسی دعویٰ کی جرأت، بلکہ حکومت واقتدار حاصل کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے جس کے نام پر سیاست کی بساط بچھائی جاتی ہے۔

کسی بھی مذہب کی آفاقیت ودائمیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل نظام حیات ہو، خواہ اس کا تعلق ذاتی واجتماعی نظام سے ہو یا سیاسی انتظام سے، اس ناحیہ سے کسی بھی مذہب کے پاس بنیادی اصول بھی نہیں ہیں، اور نہ ہی کسی مذہب میں ایسے دعوے کی جرأت ہے، جبکہ اسلام نہ صرف بنیادی اصول فراہم کرتا بلکہ فروعات کے ساتھ ان کی عملی مثالیں بھی پیش کرتا ہے، اور قیامت تک دنیا کی ہر قوم اور ہر خطہ کے لیے مکمل نظام حیات اور دائمی و پائیدار امن کا منشور بھی پیش کرتا ہے لیکن دیگر مذاہب کے ٹھیکیداروں کے ذاتی مفادات اسلام کی پیش رفت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں جس کے نتیجہ میں پوری دنیا حقیقی امن وسکون سے محروم ہے۔

فقہی مسائل

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: آج کل یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مسلمان کثرت سے عمرہ کرنے مکۃ المکرمۃ جاتے ہیں اور حرمین شریفین کی زیارت سے فیضیاب ہوتے ہیں، سوال یہ ہے کہ عمرہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ حج ہی کی طرح فرض یا واجب ہے؟

جواب: عمرہ کرنا حج کی طرح فرض یا واجب نہیں ہے، بلکہ استطاعت رکھنے والوں کے لیے زندگی میں ایک مرتبہ صحیح قول کے مطابق سنت مؤکدہ ہے، سنت مؤکدہ واجب کے قریب قریب ہے اس لیے بعض فقہاء اس کو واجب کہہ دیتے ہیں، کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے:

العمرة تسمى الحج الأصغر وهي في العمر مرة سنة مؤكدة لمن استطاع وهو المذهب۔ [غنیۃ، ص ۱۹۶]

سوال: عمرہ کے افعال کیا ہیں اور کل کتنے ہیں؟

جواب: عمرہ کے افعال چار ہیں:

۱-احرام باندھنا: اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ احرام حدودِ حرم سے باہر باندھنا لازم ہے، اگر آفاقی ہو یعنی میقات سے باہر رہنے والا ہو جیسے ہندوستانی تو ان کی میقات یا میقات سے پہلے احرام باندھنا لازم ہے، اور حدودِ حرم یا حل میں رہنے والوں پر حدودِ حرم سے باہر حل میں جا کر احرام باندھیں۔

۲-عمرہ کا دوسرا عمل طواف ہے۔

۳-تیسرا عمل صفا اور مروہ کی سعی ہے۔

۴-اور چوتھا عمل سر کا حلق یا قصر ہے۔

ان چاروں افعال میں احرام باندھنا عمرہ کے لیے شرط ہے اور طواف بیت اللہ رکن اور فرض ہے اور صفا اور مروہ کی سعی کرنا اور سر کے بال کا حلق یا قصر کرنا واجب ہے۔

سوال: عمرہ کے چار افعال ادا کرنے میں کیا ترتیب ضروری ہے یا آگے پیچھے کی گنجائش ہے؟

جواب: عمرہ کے چاروں افعال کی ادائیگی میں ترتیب ضروری ہے۔ یعنی احرام کے بعد پہلے عمرہ کا طواف ہوگا، پھر صفا و مروہ کے درمیان سعی ہوگی اس کے بعد سر کے بال مونڈوائے جائیں گے یا قصر ہوگا، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی نے عمرہ میں طواف سے قبل صفا و مروہ کی سعی کر لی تو یہ سعی صحیح نہیں ہوگی، اس کی تلافی کے لیے اگر کوئی دم (چھوٹے جانور کی قربانی) دیدے تو یہ کافی نہیں ہوگی؛ بلکہ طواف کے بعد دوبارہ سعی کرنا لازم ہوگا، سعی اور حلق یا قصر کے درمیان ترتیب واجب ہے، شرط نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی طواف عمرہ کے بعد پہلے حلق یا قصر کر لے اور اس کے بعد سعی کر لے تو اس صورت میں دم دینا لازم ہوگا اور ترتیب کے ساتھ دوبارہ دونوں کا اعادہ لازم نہیں ہوگا۔ [غنیۃ جدید، ص ۱۹۷]

سوال: عمرہ کے افعال ادا کرنے میں کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی تلافی اور کفارہ کی کیا صورت ہوگی؟

جواب: عمرہ کے افعال ادا کرنے میں کوئی غلطی ہو جائے یا بالقصد کوئی جرم ہو جائے تو کفارہ میں صرف دم (بکرے کی قربانی) لازم ہوتا ہے بدنہ یعنی اونٹ، گائے، بھینس وغیرہ بڑے جانور کی قربانی کسی بھی صورت میں لازم نہیں ہوگا، دم میں بھی شرط ہے کہ حرم ہی میں ہو۔ [حوالہ سابق]

سوال: عمرہ میں طوافِ قدوم اور طوافِ وداع کا کیا حکم ہے؟

جواب: پہلے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مکۃ المکرمہ میں داخل ہونے کے بعد بیت اللہ کا جو طواف کیا جاتا ہے اس کو طواف قدوم کہتے ہیں اور واپسی پر جو طواف کیا جاتا ہے اس کو طواف وداع کہتے ہیں اور یہ دونوں طواف سفرِ حج میں مسنون ہیں۔

لیکن عمرہ میں طوافِ قدوم اور طوافِ وداع مسنون نہیں ہیں، لہٰذا جب کوئی عمرہ کے ارادہ سے احرام باندھ کر حرم شریف پہنچے تو طواف عمرہ ہی سے عمل شروع ہوگا وداع کرنا واجب یا مسنون نہیں، بلکہ بغیر طواف وداع کے واپسی ہو جائے گی لیکن اگر عمرہ کر کے واپسی کے وقت طواف کرے تو یہ نفلی طواف ہوگا، واجب نہیں، اگرچہ بعض فقہاء نے طواف وداع کو عمرہ کرنے والوں کے لیے واجب قرار دیا ہے، لیکن راجح اور مفتی بہ قول یہ ہے کہ سفر عمرہ میں طواف وداع نہ واجب ہے اور نہ ہی مسنون، تاہم عمرہ ادا کرنے کے بعد واپسی کے وقت کوئی طواف کر لے تو یہ بہتر اور افضل ہے۔ [غنیۃ جدید، ص ۱۹۸]

سوال: نفل عمرہ اگر چند لوگوں کی طرف سے کیا جائے تو کیا ایک عمرہ چند افراد کی طرف سے کافی ہو جائے گا یا الگ الگ نام سے اللہ تعالیٰ عمرہ کرنا پڑے گا؟

جواب: نفل عمرہ نفل نماز کی طرح ہے، یعنی ایک عمرہ کے ثواب میں ایک سے زیادہ افراد کو شامل کیا جا سکتا ہے؛ لیکن اگر چند لوگوں نے اپنی اپنی طرف سے عمرہ کرنے کے لیے کہا ہے تو اس صورت میں ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ عمرہ کرنا ہوگا۔

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date 25th November 2025

تاریخ ۲۵/نومبر ۲۰۲۵ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا